اُردُو نثر کی داستان

قسط ۱۰

ہر ماہ کی یکم تاریخ کو

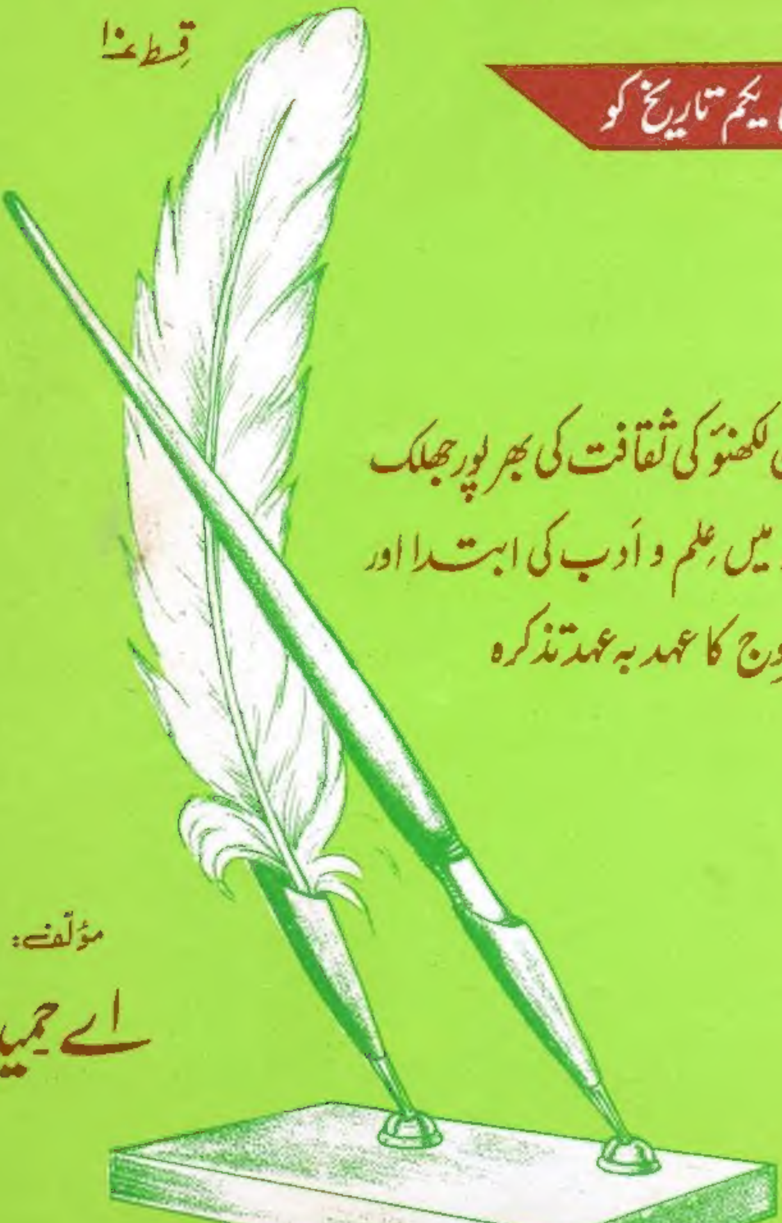

دبستانِ لکھنؤ کی ثقافت کی بھرپور جھلک
اور اَودھ میں عِلم و اَدب کی ابتدا اور
عروج کا عہد بہ عہد تذکرہ

مؤلف:
اے حمید

۱۰

روشن کتابیں

مطبوعات شیخ غلام علی، اَدبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

اُردو ادب کے شائقین کے لیے روشن کتابوں کی

ایک خصوصی پیشکش

اُردو نثر کی داستان

قسط ۱۰

دبستانِ لکھنؤ کی ثقافت کی بھرپور جھلک

اور

اَودھ میں عِلم و اَدب کی ابتدا اور عروج

کا عہد بہ عہد تذکرہ

مؤلّف

اے حمید

روشن کتابیں

مطبوعات شیخ غلام علی

ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

ایک تاریخی و اَدبی دستاویز

روشن کتابوں کے قسط وار ادبی سلسلے "اُردو نثر کی داستان" کی اہمیت و افادیت کے بارے میں ہمارے باذوق قارئین ہی بہتر رائے پیش کر سکتے ہیں تاہم اِس ضمن میں ہم یہ ضرور کہیں گے کہ اُردو ادب میں دل چسپی رکھنے والے احباب کے لیے یہ سلسلہ ایک تاریخی اور ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا اُردو ادب میں الگ ایک مقام ہے۔

اِس وقت تک ہم 'اُردو نثر کی داستان' کی نو اقساط اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر چکے ہیں۔ ان نو اقساط میں اُردو نثر کی ابتدا اور اس کی ترویج کی ایک پوری داستان سمیٹی گئی ہے۔ آج اُردو نثر کی داستان اپنی دسویں قسط کے ساتھ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس قسط میں جہاں دبستانِ لکھنؤ کی ثقافت کی بھرپور جھلک پیش کی گئی ہے وہاں اَودھ میں علم و ادب کی ابتدا اور عروج کا عہد بہ عہد تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ ہم اپنے قارئین سے یہ اُمید رکھتے ہیں کہ وہ اس قسط کے ساتھ ہی اُردو نثر کی داستان کی گذشتہ نو اقساط کا بھی مطالعہ کر کے ہمیں اپنی رائے سے ضرور نوازیں گے۔

ہماری آج کی دوسری کتاب "منزلِ عشق" ہے جسے عبدالرحمٰن طارق نے احادیث اور تاریخ کی مستند کتب کے حوالے سے قرآنِ پاک کے احکامات کے پس منظر اور پیش منظر میں رکھ کر ترتیب دیا ہے۔ اس کتاب میں حضرت یوسف علیہ السّلام اور زُلیخا کے مشہور قرآنی قصّے کو بیان کیا گیا ہے جسے خُداوند تعالیٰ نے احسن القصص کا نام دیا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں بھی ہم اپنے قارئین کی رائے کے منتظر رہیں گے۔

دس اگست کو مُسلم شخصیات کے انسائیکلوپیڈیا کی گیارھویں قسط کے ساتھ ایک خوبصورت ناول پیش کیا جا رہا ہے "سپنوں کی وادی"۔ یہ ناول ہمارے ایک لائق پروفیسر اور ادیب جناب عاصم صحرائی نے انگریزی سے ترجمہ کیا ہے۔ ناول کی خوبصورتی کا اندازہ آپ اِسے پڑھنے کے بعد ہی لگا سکیں گے۔

نیاز احمد

دُنیا کی ہر قومی اور علاقائی زبان کی روشن کتابوں کا انتخاب

نگران : شیخ نیاز احمد

مُدیر مسئول : ارشد نیاز

مُدیر : رب نواز ملک

مجلسِ مشاورت :

اے حمید۔ ایم۔ ایس ناز

محمد حنیف شاہد۔ عینکاف خالد

آرٹ : سلیم اختر

طابع : شیخ نیاز احمد

مطبع : غلام علی پبلشرز، لاہور

ادارہ :

مطبوعات شیخ غلام علی

اُردو بازار مارکیٹ، چوک انار کلی، لاہور

ٹیلیفون نمبر :

۵۲۹۰۸ ۶۱۸۵۹ ۲۱۳۰۲۰

تار :

کتاب مین (KITABMAN) لاہور

تھے۔ غرض ملک میں ہزاروں دشمن تھے جن سے خطرہ تھا کہ نواب کی جان پر حملہ نہ کر دیں رعایا کے علاوہ فوج بھی نئے نواب سے نہایت ناراض تھی۔ بے شمار فوج کا ٹڈی دل جو نواب شجاع الدولہ کے عہد میں جمع تھا اس میں آصف الدولہ کے زمانے ہی میں سرکار انگریزی کے ایما سے تخفیف ہونا شروع ہو گئی تھی۔ مگر آصف الدولہ کی فیاضیوں اور فضول خرچیوں نے بہلائے رکھا۔ اور شکایت کی آواز زیادہ بلند نہیں ہونے پائی۔ سعادت علی خان نے جب زیادہ تخفیف کی تو ہر طرف ہائے ہائے پڑ گئی اور جو تھا ان کی جان کو رو رہا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی جان کی حفاظت کے لئے سرکار انگریزی کو ضرورت معلوم ہوئی کہ انگریزی باضابطہ فوجی گارڈ خاص شہر کے اندر رکھا جائے۔ کیونکہ شہر کے مفسدوں اور سرکشوں کی سرکوبی کے لئے اور نیز امن و امان قائم رکھنے کی غرض سے ایک بیرونی زبردست قوت کا ہر وقت شہر میں موجود رہنا بہت ضروری تھا جس کی نسبت سنا جاتا ہے کہ نواب سعادت علی خان نے اس کو نہایت ہی ناگواری کے ساتھ منظور کیا۔ فرمانروایان اودھ نے اس سے پہلے اپنے رہنے سہنے کے متعلق نہایت ہی سادگی ظاہر کی تھی۔ پہلے تین حکمرانوں یعنی نواب برہان الملک نواب صفدر جنگ اور نواب شجاع الدولہ نے جن سادے مکانوں میں زندگی بسر کی تھی وہ بھی ان کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ کرائے پر تھے۔ انہوں نے اپنا اصلی مکان یا تو میدان جنگ کو بنایا یا ساری مملکت کو جس میں دورہ کرتے رہتے تھے نواب آصف الدولہ اگرچہ نہایت ہی عیاشی اور فضول خرچی میں بدنام تھے مگر ان کے لئے بھی صرف ایک سادہ پرانی قلع کا مکان یعنی پنچ محلا کافی تھا۔ حالانکہ انہیں عمارت کا بڑا شوق تھا۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ بیس لاکھ روپے ایک امام باڑے اور مسجد کی تعمیر میں صرف کر دیئے اور اس سے زیادہ ہی رقم چوک۔ مختلف بازاروں منڈلیوں۔ پلوں اور سراؤں وغیرہ کی تعمیر میں خرچ کی۔ غرض پہلے تین حکمرانوں کا شوق تعمیر اگر قلعوں وغیرہ کی تعمیر اور فوجی سامان کی فراہمی میں صرف ہوتا تھا تو آصف الدولہ کا شوق دینداری کی عمارتوں میں یا نفع رسانی خلق اللہ کے کاموں میں۔ اس کے ساتھ عمارت کا قدیم مذاق بھی اب تک نبھتا چلا آ رہا تھا۔

لیکن نواب سعادت علی خان کو باوجود کفایت شعاری اور روپیہ جمع کرنے کی ہوس کے مکانوں اور عمارتوں کا شوق تھا۔ مگر افسوس ان کا یہ شوق کلکتے وغیرہ میں رہنے اور مختلف مقامات کی عمارتوں کو دیکھنے کی وجہ سے ایسا غارت ہو گیا تھا کہ ان کے عہد کی عمارتوں سے وہ پرانی خصوصیات جدا ہو گئیں اور اس وقت سے گویا عمارت کا مذاق ہی بدل گیا۔

سعادت علی خان نے پہلے کوٹھی فرحت بخش پچاس ہزار روپے پر جنرل مارٹن سے مول لی۔ اسی میں رہنا شروع کیا اور اس کے متصل اور کئی مکان بنوائے۔ پھر وہاں سے قریب ہی صاحب ریذیڈنٹ کی سکونت کے لئے ٹیڑھی کوٹھی تعمیر کی جس کے کھنڈر ریذیڈنسی کے اندر پڑے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد اپنے دربار کے لئے انہوں نے لال بارہ دری تعمیر کروائی جس میں اب کتب خانہ ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے دریا پار دل آرام کے نام سے ایک کوٹھی تعمیر کروائی۔ علاوہ بریں نواب ممدوح نے مشہور عمارتیں بھی تعمیر کروائیں۔ ان سب عمارتوں کی تعمیر میں پرانی عمارت کی وضع ترک کر دی گئی اور یورپ سے آئی ہوئی جدتیں اختیار کی گئیں۔

معاشرتی حالات

سعادت علی خان اودھ کے تمام فرماں رواؤں سے زیادہ بیدار مغز مدبر اور اس کے ساتھ ساتھ نہایت کفایت شعار تھے۔ ملک کا انتظام انہوں نے غیر معمولی ہوشیاری سے کیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ان کو آخر عہد تک پورا اطمینان نصیب ہو جاتا تو تمام گزشتہ بدنظمیاں اور خرابیاں دور ہو جاتیں۔ اور وہ ملک کی پوری پوری اصلاح کر جاتے۔ لیکن خرابی یہ ہوئی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے نہیں رہے تھے یہاں تک کہ بعض اوقات ان کا دل تاج و تخت اور فرماں روائی سے کھٹا ہو جاتا تھا ان ہی باتوں سے عاجز آ کے انہوں نے آدھے سے زیادہ ملک سرکار برطانیہ کے سپرد کر دیا۔ اور سمجھے کہ اب میں اپنے مقبوضہ علاقے میں بے تردد حکومت کر سکوں گا۔ مگر افسوس کہ اب بھی ان کو اطمینان اور چین نہ نصیب ہوا۔ جو ملک ان کے قبضے میں چھوڑا گیا تھا اس میں بھی جا بجا انگریزی فوج کے کیمپ قائم کئے گئے۔ اور بڑی مقدار خاص لکھنؤ اور اس کے حوالی میں مقیم تھی۔ جس کی سنبھال کرنا دشوار تھی۔

اس کی تعداد کے زیادہ ہونے سے سلطنت پر سخت بوجھ پڑ گیا۔ اس کے مقابلے میں انہیں اپنی بہت سی فوج گھٹا دینا پڑی۔ ان پریشانیوں کے باوجود انہوں نے جو اصلاحات رائج کیں وہ بڑی قابل قدر ہیں۔ سب سے عجیب بات یہ ہوئی کہ بازاروں کی ترقی اور تجارت کے فروغ کے ساتھ ان کے دربار میں باکمال اور قابل قدر لوگوں کا اتنا بڑا مجمع ہو گیا تھا کہ اس وقت کے ہندوستان کے کسی دربار میں ایسے صاحب کمال لوگ نظر نہ آ سکتے تھے۔ ایسے لوگ اکثر اسی جگہ جمع ہوا کرتے ہیں جہاں کے رئیس معمول سے زیادہ فیاضی ظاہر کرتے ہوں۔ سعادت علی خان جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں جزرس اور بخیل تھے۔ مگر اس بخل اور کفایت شعاری کے ساتھ یہ صفت تھی کہ ان کی ذاتی قابلیت دوسرے باکمالوں کی لیاقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتی تھی اور اس بات نے ان کے ہاتھوں سے ایسے لائق لوگوں کی بڑی قدر کروائی اور لکھنؤ پہلے سے زیادہ اہل کمال کا مرجع بن گیا۔ جو قابل آدمی جہاں ہوتا سعادت علی خان کی قدردانی کی شہرت سنتے ہی اپنے وطن کو خیرباد کہہ کے لکھنؤ کا رخ کرتا اور یہاں آ کے ایسا آرام پاتا کہ وطن کا نام نہ لیتا۔

۱۸۱۴ء میں نواب سعادت علی خان نے سفر آخرت کیا اور ان کے بیٹے غازی الدین حیدر مسند حکومت پر رونق افروز ہوئے۔ قیصر باغ کی مربع عمارت کے اندر نواب سعادت علی خان اور ان کی بی بی مرشد زادی کے مقبرے ہیں۔ ان دونوں مقبروں کی جگہ ایک مکان تھا جس میں نواب غازی الدین حیدر ایام ولی عہدی میں رہا کرتے تھے۔ باپ کی آنکھیں بند ہوتے ہی جب وہ شہر یاری میں گئے تو کہا۔ میں نے والد کا گھر لیا ہے تو ضرور ہے کہ اپنے مکان انہیں رہنے کو دے دوں۔ اس خیال کے مطابق مرحوم کو اپنے گھر میں دفن کرایا اور پرانا مکان گرا کر یہ مقبرے تعمیر کرا دیئے۔

غازی الدین حیدر کا لکھنؤ

غازی الدین حیدر کے عہد میں نہ باپ کی سی بیدار مغزی اور دولت کی قدر تھی اور نہ اگلے فرمانرواؤں کی سی فوجی سرگرمی۔ ہاں آصف الدولہ کے عہد کی سی آرام طلبی اور عیش پرستی ضرور تھی۔ مگر اس میں بھی یہ فرق تھا کہ آصف الدولہ کا اسراف بھی ملک و

ملت کی نفع رسانی کے لیے ہوتا تھا اور اب خالص نفس پروری تھی۔ غازی الدین حیدر کو باپ کا جمع کیا ہوا کروڑوں روپے کا خزانہ مل گیا تھا جو شاہی شوق پورا ہونے میں نہایت وریا دلی سے اڑنے لگا۔ موتی محل میں ہم کہہ آئے ہیں کہ شمالی جانب سعادت علی خاں نے ایک کوٹھی تعمیر کرائی تھی۔ غازی الدین حیدر نے اس احاطے میں دو اور کوٹھیاں تعمیر کرائیں جن کے نام مبارک منزل اور شاہ منزل قرار دیئے گئے۔ شاہ منزل کے پاس کشتیوں کا ایک پل تھا اور مبارک منزل اس سے مشرق کی طرف بنی ہوئی تھی۔ شاہ منزل کے محاذی دریا پار رمنہ تھا جو ہزاری باغ کے نام سے موسوم تھا۔ اور اس میں میلوں تک نزہت بخش سبزہ زار چلا گیا تھا اس میں اکثر مست ہاتھی۔ گینڈے اور وحشی درندے لڑائے جاتے اور بادشاہ اس پار شاہ منزل کے کوٹھے پر جلوہ فرما ہو کے ان کی لڑائی کا تماشہ دیکھتے بشیروں کی لڑائی بھی دہیں ہوتی جس کے لیے مضبوط کٹہرے اور ایک عمدہ سرکس بنا ہوا تھا مگر جو چھوٹے غیر آزار رساں جانور لڑائے جاتے ان کی لڑائی خاص شاہ منزل کے احاطے میں ہوتی۔

غازی الدین حیدر نے اپنی ایک یورپین بی بی کے لیے ولائتی محل بنوایا اور اس کا نام ولائتی باغ قرار دیا۔ وہاں سے قریب ہی قدم رسول کی عمارت تعمیر کرائی۔ غازی الدین حیدر کی آرزو کے موافق دربار انگریزی سے انہیں بادشاہ کا لقب عطا کیا گیا۔ اس سے پیشتر فرماں روایان اودھ وزیر کے رتبے کے سمجھے جاتے تھے اور سوائے نواب کے اور کسی اعزازی لقب سے یاد نہیں کیے جاتے تھے۔ اس زمانے تک ہندوستان میں شہنشاہی مغلیہ کی اتنی آن باقی تھی کہ اگرچہ ملک خود مختار و خود سر حکمرانوں میں بٹ گیا تھا اور شہنشاہ دہلی کے قبضے میں صرف دہلی کے گرد و پیش کی زمین باقی رہ گئی تھی لیکن اس بے بضاعتی پر بھی شہنشاہ جہاں پناہ رہی تھے۔ نہ سربرآوریان دہلی کے سوا ہندوستان میں کسی کو "بادشاہ" کہلانے کا حق تھا اور نہ خطاب و عزت دینے کا۔ ان کے اس غرور کے توڑنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے غازی الدین حیدر کو شاہی خطاب دیا اور دربار اودھ نے اس عزت و سرفرازی کو نہایت ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ چنانچہ اس وقت سے حکمرانان اودھ جو ریذیڈنٹوں کے ہاتھوں کے کھلونے تھے بادشاہ بن گئے۔ اور آخری فرماں روا واجد علی شاہ کے مرنے تک ان کا سرمایۂ ناز رہے۔

غازی الدین حیدر نے باپ کے خزانے میں سے انگریزوں کو بہت سا روپیہ قرض بھی دے رکھا تھا۔ بادشاہ کو اور ان سے زیادہ بادشاہ بیگم کو مذہبی معاملات میں بہت زیادہ انہماک تھا۔ صفویہ خاندان کے زمانے سے ایران کا مذہب شیعہ اثنا عشری تھا۔ مگر ہندوستان کے عام مسلمان سُنّی تھے۔ نواب برہان الملک چونکہ ولایت سے نئے نئے آئے تھے اس لیے ان کا اور ان کے سارے خاندان کا مذہب شیعہ تھا۔ باوجود اس کے زمانے تک لکھنؤ میں حکومت کا وہی قدیم طریقہ چلا آتا تھا جو آغاز سلطنت اسلام سے دیگر بلاد ہند اور سارے ملک کا تھا۔ مگر اس وقت سے بادشاہ اور ان کے خاص محل کے انہماک مذہبی کی وجہ سے شیعیت عالمت لکھنؤ کا ایک نمایاں عنصر بن گئی۔ فرنگی محل کے علما کی طرف سے حکمرانوں کی توجہ ہٹ گئی اور خاندان اجتہاد عروج پا کے سلطنت کا اصلی مقنن قرار پایا۔

لیکن شیعہ مذہب اپنی اصلی حالت پر قائم رہتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ خرابی یہ ہوئی کہ بادشاہ بیگم کی جاہلانہ اور امیرانہ مذہبی سرگرمی نے مذہب شیعہ میں نئی نئی بدعتیں ایجاد کیں۔ جن کی وجہ سے اس قدر نہیں ہوا کہ بادشاہوں اور امیروں میں طرح طرح کی طفلانہ مزاجیاں پیدا ہوئیں بلکہ لکھنؤ کی شیعیت ساری دنیا کی شیعیت سے نئی نرالی اور عجیب ہو گئی۔ سب سے پہلے بیگم صاحبہ نے امام صاحب العصر کی چھٹی کی رسم قرار دی جس میں اگر یہ ہوتا کہ کسی محفل میں امام ممدوح کے حالات بیان کر کے ثواب حاصل کر لیا جائے تو مضائقہ نہ تھا۔ مگر نہیں۔ یہاں ہندوؤں کے جنم اشٹمی کے رسوم کے موافق پورا زچہ خانہ مرتب کیا جاتا۔ اس کے بعد یہ ترقی ہوئی کہ صحیح النسب سیدوں کی خوبصورت لڑکیاں لے کے ائمۂ اثنا عشری کی بیبیاں قرار دی گئیں۔ جن کا نام "اچھوتیاں" رکھا گیا۔ اور جب وہ اماموں کی بیبیاں تھیں تو پھر ان کے ہاں اماموں کی ولادت بھی ہوتی۔ اور بارہوں اماموں کی ولادت کی تقریبیں بڑے کر و فر سے منائی جاتیں۔

غازی الدین حیدر نہایت ہی غضب ناک اور آشفتہ مزاج بادشاہ تھے اور رعب داب اس بلا کا تھا کہ ان کے زمانے میں انگریزوں سے تعلقات تو اچھے رہے مگر آغا میر جو وزیر السلطنت تھا دربار پر اس قدر حاوی تھا کہ خود بادشاہ بیگم اور ولی عہد سلطنت تک اس کے آزار سے محفوظ نہ رہ سکے۔ غازی الدین حیدر اسے گھونسوں سے اور لاتوں سے مارتے۔ اس مار کو وہ خوشی سے کھا لیتا۔ مگر اس کا بدلہ دیگر معززین دربار اور اعزائے شاہی سے لیا کرتا۔ اس سے پہلے بادشاہ اودھ نے مذہبی ارادت و عقیدت سے دریا کنارے اور موتی محل کے متصل نجف اشرف یعنی روضۂ مطہرہ حضرت علیؑ کی نقل لکھنؤ میں بنوائی اور اس کی روشنی و خدمت کے لیے بہت سا روپیہ سرکار انگریزی کے حوالے کیا۔ جس کی بدولت آج تک وہ بارونق اور خوب آباد ہے۔ چنانچہ غازی الدین حیدر نے ۱۸۲۷ء میں جب انتقال کیا تو اسی جگہ دفن ہوئے۔

نصیر الدین حیدر کا دور

۱۸۲۷ء میں غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نصیر الدین حیدر تخت پر بیٹھا غازی الدین حیدر کے زمانے سے جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ فرماں روایان اودھ نواب امین بادشاہ تھے اس دولت کا آغاز وزارت دہلی کے درجے سے ہوا تھا اور پچھلے زبردست فرماں روا سب نواب وزیر کہلاتے تھے۔ لیکن اب جبکہ اصلی حکومت رخصت ہو چکی تھی اور ہندوستان کی سیاسیات میں ان لوگوں کا بالکل اثر باقی نہیں رہا تھا یہ بادشاہ بن گئے۔

خیال کیا جا سکتا ہے کہ انگریزوں نے اودھ کے حکمرانوں کو بادشاہی عزت دی تو اپنی پشت پناہی سے ان کی سطوت بھی بڑھا دی ہوگی۔ اور انہیں نام ہی کا بادشاہ نہیں بلکہ حقیقتاً بادشاہ بنا کے دکھا دیا ہوگا۔ لیکن نہیں ہمیں یہ نظر نہیں آتا۔ اس عہد میں اودھ کے باہر ان لوگوں کا اثر تو بالکل تھا ہی نہیں۔ خود اپنی قلمرو میں بھی یہ اتنے آزاد نہ تھے جتنے کہ ان کے پہلے کے بزرگ ہوتے آئے تھے۔ اب کسی کی تخت نشینی بغیر انگریزوں کی منظوری کے ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ انگریزی فوج ساری قلمرو میں جابجا پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی اہم معاملہ بغیر صاحب ریذیڈنٹ کی دخل دہی کے طے ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ سریر شہریاری ایک اسٹیج تھا جس پر جو کچھ ہوتا بہ ظاہر نظر آتا کہ ایکٹر کر رہے ہیں مگر اصل میں وہ افعال کسی اور شخص کے قبضہ قدرت میں تھے جو پردے کی آڑ میں تھا اور جو جی چاہتا تھا کرتا تھا۔

مگر خدا کی اتنی مہربانی تھی کہ ان پچھلے حکمرانانِ اودھ کی اور ان کے ساتھ

قریب قریب سارے وابستگانِ دامنِ دولت کی جیب غائب ہو گئی تھی جس کی بدولت وہ اپنی کمزوری و بے دست و پائی کو بالکل محسوس نہ کر سکتے تھے۔ غازی الدین حیدر بادشاہ بنتے ہی عیش و عشرت میں مشغول ہو گئے اور نصیر الدین حیدر کو تختِ شاہی ورثے میں ملا تھا۔ نواب سعادت علی خان کا جمع کیا ہوا روپیہ عیش پرستی میں دونوں کا ممد و معاون ہوا۔ کچھ انگریزوں کو قرض دیا گیا۔ کچھ رسم پرستی کی نظر ہو گیا باقی فضول خرچیوں اور عیاشیوں میں ضائع ہونے لگا۔ غازی الدین حیدر نے تو اتنا بھی کیا تھا کہ نجفِ اشرف کی نقل بنوا کر اپنی قبر کا ٹھکانہ کر لیا اور بغیر اس کے کہ اپنے ورثے پر بھروسہ کریں کچھ روپیہ انگریزوں کے حوالے کر دیا کہ اس کے سود سے پورے دینی آداب کے ساتھ نجف کی نگہداشت کیا کریں۔ چنانچہ آج تک ان کی قبر پر چراغ روشن ہوتا ہے۔ مجلسیں ہوتی ہیں۔ قرآن خوانی ہوتی ہے اور محرم میں خوب روشنی ہوتی ہے۔ جس کے طفیل تھوڑے سے غریبوں کی پرورش ہو جایا کرتی ہے۔

مگر نصیر الدین حیدر کو ہجومِ عیش میں اتنی بھی توفیق نہ ہوئی۔ دریا پار محلہ ارادت نگر میں انہوں نے ایک کربلا بنوائی جو خود ان کا مرقد قرار پانے والی تھی مگر اس کی خدمت داشت کی ذرا بھی فکر نہیں کی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج وہ ڈالی گنج کے اسٹیشن کے پاس اجاڑ اور خاموش پڑی ہے اور شاید کوئی چراغ جلانے والا بھی وہاں نہیں۔ ان کے زمانے میں نئے محلے گنیش گنج اور چاند گنج وہیں دریا پار آباد ہوئے۔

نصیر الدین حیدر کو نجوم سے عقیدت تھی جس نے علمِ ہیئت کی طرف توجہ دلائی اور ارادہ کیا کہ اپنے شہر میں ایک اعلیٰ درجے کی رصدگاہ قائم کریں۔ چنانچہ اس غرض کے لئے ایک کوٹھی نواب سعادت علی خان کے مقبرے اور موتی محل کے درمیان میں بنائی جو رصدگاہ ہونے کے باعث لکھنؤ میں "تارے والی کوٹھی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس میں بڑی بڑی دوربینیں اور اعلیٰ درجے کے آلاتِ رصد جمع کئے گئے۔ ان کے مناسب طور پر قائم کرنے کا کام اور ان کا انتظام کرنل ولکاکس کے سپرد ہوا جو ایک اچھے ہیئت داں تھے۔ مگر لکھنؤ کی یہ رصدگاہ گویا کرنل صاحب موصوف کی زندگی کا ایک مجہول الحال واقعہ تھی۔ کیونکہ ۱۲۵۶ ہجری سے نصیر الدین حیدر کی سلطنت کا آغاز ہوا۔ جس کے چار سال بعد غالباً یہ رصدگاہ قائم ہو گئی اور اس وقت سے ۱۲۷۲ ہجری تک جبکہ آخری تاجدارِ اودھ واجد علی شاہ کا زمانہ تھا یہ رصدگاہ انہیں کے اہتمام میں رہی۔ سنہ مذکورہ میں کرنل صاحب کا انتقال ہوا اور ان کی جگہ کوئی ہیئت داں اس خدمت پر مامور نہیں کیا گیا۔

واجد علی شاہ نے اس کی طرف سے بے پروائی کی۔ لکھنؤ کے بعض مستند اشخاص کی زبانی سنا گیا کہ اس کی سب سے بڑی دوربین کو واجد علی شاہ نے ایک کھلونا خیال کر کے حیدری طوائف کے حوالے کر دیا تھا۔ لیکن گزیٹیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رصدگاہ انتزاعِ سلطنت کے زمانے تک قائم تھی۔ غدر میں غالباً بلوائیوں نے اسے تباہ کر دیا۔ کیونکہ احمد شاہ نے جو ڈنکا شاہ بھی کہلاتے تھے اور انگریزی فوج سے بڑی بہادری سے لڑتے تھے تارے والی کوٹھی ہی میں سکونت اختیار کی تھی اسی میں اپنا دربار قائم کیا تھا اور باغی فوجوں کے افسر یہیں جمع ہو کے مشورے کیا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں روشن الدولہ نے جو وزیرِ سلطنت تھے اپنی خوبصورت اور شاندار کوٹھی تعمیر کرائی۔ اس لئے کہ واجد علی شاہ نے اس کوٹھی کو قیصر باغ بنواتے وقت ضبط کر لیا تھا اور جب ملک انگریزوں کے قبضے میں آیا ہے یہ کوٹھی ایک سرکاری جائیداد تھی۔

نصیر الدین حیدر کا زمانہ سچ یہ ہے کہ نہایت ہی خطرناک زمانہ تھا۔ ایک طرف تو انتظامِ مملکت کی خرابی تھی۔ بادشاہ کو عیش و عشرت اور اپنی ایجاد کردہ دینداری کی رسموں سے فرصت نہ ملتی تھی۔ سارا نظامِ سلطنت وزیر پر چھوڑ دیا جاتا تھا اور وزیروں کی یہ حالت تھی کہ کوئی ایسا شخص ملتا ہی نہ تھا جو نیک نیتی اور خوش تدبیری سے کام چلا سکے۔ حکیم مہدی بلائے گئے وہ منتظم تو اچھے تھے مگر چاہتے تھے کہ سلطنت کو اپنی ہی میراث بنا لیں۔ روشن الدولہ وزیر ہوئے۔ ان میں نہ مادہ تھا نہ طبیعت داری۔ ان سے کچھ کرتے دھرتے نہ بنی۔ بادشاہ کی فضول خرچیوں کی یہ حالت تھی کہ سعادت علی خان کا جمع کیا ہوا سارا روپیہ پانی کی طرح اُڑ گیا۔ اور ملک کی آمدنی محل کے سارے اخراجات کے لئے کافی نہ تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ بادشاہ اور ان کی ماں غازی الدین حیدر کی خاص محل میں جھگڑے پڑ گئے۔ وہ مُنا جان کو بادشاہ کا بیٹا بتاتی تھیں اور بادشاہ اس کو اپنا بیٹا تسلیم نہ کرتے تھے۔ ان باتوں نے ملک کی ایسی حالت کر دی تھی کہ معلوم ہوتا تھا حکمرانوں میں حکومت کرنے اور ملک سنبھالنے کی مطلق صلاحیت نہیں۔

گورنر جنرل ہند نے بار بار سمجھایا۔ ڈرایا۔ دھمکایا۔ انجام سے مطلع کیا اور برابر کان کھولتے رہے مگر یہاں کسی کے کان پر جوں نہ رینگی۔ نصیر الدین حیدر میں عورتوں میں رہتے رہتے اس درجہ زنانہ مزاجی پیدا ہو گئی تھی کہ عورتوں کی سی باتیں کرتے اور عورتوں ہی کا سا لباس پہنتے۔ زنانہ مزاجی کے ساتھ مذہبی عقیدت نے یہ شان پیدا کر دی کہ ائمہ اثنا عشری کی فرضی بیبیاں (اچھوتیاں) اور ان کی ولادت کی تقریبیں جو ان کی ماں نے قائم کی تھیں ان کو اور زیادہ ترقی دی۔ یہاں تک کہ ولادتِ ائمہ کی تقریبوں میں خود حاملہ عورت بن کے زچہ خانے میں بیٹھتے۔ چہرے اور حرکات سے وضعِ حمل کی تکلیف ظاہر کرتے اور پھر خود ایک فرضی بچہ جنتے جس کے لئے ولادت۔ چھٹی۔ اور نہان کے سامان بالکل اصل کے مطابق کئے جاتے۔

یہ تقریبیں اس قدر زیادہ تھیں کہ سال بھر بادشاہ کو انہیں سے فرصت نہ ملتی۔ سلطنت کی طرف کون توجہ دیتا۔ دربارِ اودھ اور سرکارِ انگریزی کے تعلقات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر گورنر جنرل اور ریذیڈنٹوں کی نظرِ عنایت نہ ہوتی اور انگلستان کا جو بورڈ ایسٹ انڈیا کمپنی کا نگران تھا کمپنی کو روکے تھامے نہ رہتا تو انتزاعِ سلطنت کی کارروائی اسی زمانے میں ہو گئی ہوتی۔ مگر اس طفلانہ مزاجی کے درباری زندگی ابھی باقی تھی۔ انگریز ملک کے لینے کا ارادہ کر کر کے رہ گئے۔

نصیر الدین حیدر کی موت

نصیر الدین حیدر کی نسبت لکھنؤ کے معتبر پرانے لوگوں کا بیان ہے کہ اس زنانہ مزاجی اور ان طفلانہ حرکتوں کے ساتھ نہایت ہی ظالم بھی تھے۔ لیکن چونکہ ساری زندگی عورتوں میں بسر ہوئی تھی اس لئے ان کے مظالم کا شکار زیادہ تر عورتیں ہی ہوتیں۔ کبھی عورتوں کو ادنیٰ قصور اور معمولی بدگمانی پر دیواروں میں چنوا دیا۔ کہتے ہیں کہ راہ چلتے کسی مرد کو کسی عورت کے سینے پر ہاتھ رکھے دیکھ لیا تھا۔ فوراً عورت کی چھاتیاں اور مرد کے ہاتھ کٹوا ڈالے۔ آخر دس برس کی بے اعتدالیوں اور ظلم و ستم کے بعد جبکہ اندر باہر کے تمام اہلِ دربار زندگی سے عاجز آ گئے تھے۔ بادشاہ خود اپنے دوستوں اور عزیزوں کے ہاتھ کا شکار رہتے۔ اور کسی نے زہر دے کر ۱۸۳۷ء میں اس ظالم اور بداعتدال شخص کا خاتمہ کر دیا۔ نصیر الدین حیدر لاولد مرے تھے۔ منا جان کو غازی الدین حیدر کی بیگم نے ہمیشہ اپنا پوتا اور سچا وارثِ سلطنت بنا کے پیش کیا مگر غازی الدین

حیدر اور نصیر الدین حیدر دونوں نے ان کے نسل شاہی ہونے سے انکار کر دیا اسی بنا پر گورنمنٹ انگریزی نے نواب سعادت علی خان مرحوم کے بیٹے نصیر الدولہ محمد علی خان کی تخت نشینی کا پہلے سے بندوبست کر لیا تھا۔ مگر بیگم صاحبہ نے نہ مانا منا جان کو لے کے لال بارہ دری یعنی تخت گاہ میں آگئیں۔ ریذیڈنٹ نے ہزار ہر کا اور سمجھایا مگر ایک نہ سنی اور زبردستی منا جان کو تخت پر بٹھا دیا۔ جنہوں نے تخت پر قدم رکھتے ہی نذریں لیں۔

منا جان نے اپنے دشمنوں سے بدلے لینے شروع کر دیئے۔ سینکڑوں کے گھر لٹوا دیئے بعضوں کو گرفتار کر لیا۔ ہزاروں کو قتل کروا دیا۔ شہر میں ایک افراتفری مچ گئی۔ صاحب ریذیڈنٹ فوراً دربار میں پہنچ گئے۔ بادشاہ بیگم کو سمجھایا کہ منا جان وارث سلطنت نہیں ہو سکتے اور اس میں آپ کی ہرگز کامیابی نہ ہوگی۔ پھر لاٹ صاحب کا تحریری فرمان دکھایا اور کہا۔ بہتر یہی ہے کہ منا جان تخت کو خالی کر دیں اور نصیر الدولہ کی تخت نشینی عمل میں لائی جائے۔ مگر کسی نے سماعت نہ کی بلکہ کسی نے ریذیڈنٹ پر حملہ کر دیا جس سے اس کا چہرہ خون آلود ہو گیا۔ ریذیڈنٹ نے انگریزی فوج پہلے ہی بلوا لی تھی۔ اس نے تخت گاہ کے سامنے توپیں لگا دی تھیں اور سپاہی صفیں باندھے کھڑے تھے۔ مجبوراً ریذیڈنٹ نے گھڑی ہاتھ میں لے لی اور کہا۔ دس منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ اس وقت کے اندر اندر اگر منا جان تخت سے نہ اترے تو توپیں فیر کر دی جائیں گی۔ اس کا بھی کسی نے خیال نہ کیا۔ حالانکہ ریذیڈنٹ بار بار کہتے جاتے تھے کہ اب پانچ منٹ باقی ہیں۔ اب دو ہی منٹ رہ گئے۔ اور اب دیکھئے پورا ایک منٹ بھی نہیں۔

ان تنبیہوں کا کسی نے خیال نہ کیا۔ اور یکایک توپوں نے گرابیں مارنا شروع کر دیں۔ آناً فاناً تیس چالیس آدمی گر گئے۔ دربار کی بدحواسی کے ساتھ گرنے پڑنے بھاگے جو طائفہ مجرا کر رہا تھا اس میں بھی کئی آدمی زخمی ہوئے۔ شیشہ آلات جھنا جھن ٹوٹ کے گرنے لگے۔ جب کئی وفادار مر گئے تو منا جان نے بھی تخت سے گر کے بھاگنے کا قصد کیا۔ مگر پکڑ لیئے گئے۔ غرض بیگم صاحب اور انہیں دونوں کو انگریزوں نے گرفتار کر لیا ساتھ ہی نصیر الدولہ کی تخت نشینی عمل میں آئی جو محمد علی شاہ کے لقب سے بادشاہ اودھ قرار پائے۔ اور منا جان اور ان کی دادی سخت حراست میں لکھنؤ سے کانپور لے اور کانپور سے قلعہ چنار گڑھ میں بھیج دیئے گئے اور دو ہزار چار سو روپیہ ماہوار ان کی تنخواہ لکھنؤ کے خزانے سے مقرر کر دی گئی۔

محمد علی شاہ کی عمر تخت نشینی کے وقت تریسٹھ برس کی تھی۔ بوڑھے تجربہ کار تھے۔ زمانے کے سرد و گرم اور دربار کی طفلانہ مزاجیاں دیکھتے رہے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ نواب سعادت علی خان کے بیٹے تھے اور ان کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بہت سنبھل کے کام کیا۔ کفایت شعاری کے اصول جاری کئے اور جہاں تک بنا انتظام کے سنبھالنے کی کوشش کی۔ مگر عمر زیادہ ہو چکی تھی اور قوٰی نے جواب دے دیا تھا۔ تخت پر بیٹھتے ہی انہوں نے حکیم مہدی کو فرخ آباد سے بلوا کے خلعت وزارت دیا۔ مگر چند ہی روز بعد وہ مر گئے۔ تب ظہیر الدولہ کو خلعت وزارت عطا ہوا۔ وہ بھی تین مہینے بعد دنیا سے رخصت ہو گئے اور منور الدولہ وزیر قرار پائے جنہوں نے دو چار مہینے کے بعد ہی استعفا دے دیا اور کربلائے معلیٰ چلے گئے۔ پھر اشرف الدولہ محمد ابراہیم خان وزیر قرار پائے جو اوروں کی نسبت ذی ہوش تھے۔

محمد علی شاہ کی تخت نشینی پر گورنمنٹ انگریزی اور سلطنت اودھ میں ایک نیا معاہدہ ہوا۔ جس کی رو سے سرکار انگریزی نے جو فوج اودھ کی نگرانی کے لیے رکھی تھی اس میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی گورنمنٹ کو یہ اختیار حاصل ہوا کہ ساری قلمرو اودھ یا اس کے جس علاقے میں بدنظمی دیکھے اسے جب تک چاہے اپنے زیر انتظام رکھے۔ بادشاہ نے ناگواری کے ساتھ اس عہد نامے پر دستخط کیے۔

تخت نشینی کے دوسرے ہی برس انہوں نے اپنا مشہور امام باڑہ حسین آباد اور اس کے قریب ایک عالی شان مسجد تعمیر کرانا شروع کی۔ جس کی بابت اہتمام کیا گیا کہ دہلی کی جامع مسجد سے رونق اور وسعت میں بڑھ جائے۔ ان دنوں لکھنؤ کی آبادی اور رونق اس قدر ترقی کر گئی تھی اور اس کثرت سے لوگ اس کے سواد میں آباد تھے کہ اسے ہندوستان کا بابل کہنا بے جا نہ تھا۔ واقعی یہ شہر ہر حیثیت سے اس عہد کا زندہ بابل تھا۔ اس مشابہت کو شاید انگریزوں یا کسی اور بارگاہ سے سن کے محمد علی شاہ نے ارادہ کیا کہ لکھنؤ کو پورا پورا بابل بنا دیں اور اپنی ایک ایسی یادگار قائم کر دیں جو ان کے نام کو تمام شاہان اودھ سے زیادہ بلندی پر دکھائے۔

انہوں نے بابل کے مینار یا وہاں کے باغ معلقہ کی طرح کی ایک عمارت حسین آباد سے قریب اور موجودہ گھنٹہ گھر کے پاس تعمیر کرانا شروع کی۔ جس میں محرابوں کے گول حلقے پر دوسرا حلقہ اور دوسرے حلقے پر تیسرا حلقہ — غرض یوں ہی اوپر تلے قائم ہوتے چلے گئے تھے۔ ارادہ تھا کہ یونہی سات منزلوں تک اسے بلند کر کے ایک اتنا بڑا اور اونچا برج بنا دیا جائے جو دنیا بھر میں لاجواب ہو اور اس کے اوپر سے سارے لکھنؤ اور اس کے گرد کی فضا کو دیکھا جائے ابھی اس عمارت کی پانچ منزلیں ہی تیار ہوئی تھیں کہ محمد علی شاہ کا انتقال ہو گیا۔ یہ ۱۸۴۲ء کا واقعہ ہے۔

امجد علی شاہ کا عہد

محمد علی شاہ کے بعد امجد علی شاہ تخت نشین ہوئے محمد علی شاہ نے کوشش کی تھی کہ ولی عہد سلطنت کی تعلیم اعلیٰ درجے کی ہو۔ چنانچہ انہیں علما کی صحبت میں رکھا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امجد علی شاہ بجائے اس کے کہ تعلیم میں کوئی نمایاں ترقی کریں۔ اخلاق اور عادات کے لحاظ سے ایک ثقہ مولوی بن گئے۔ عنان حکومت ہاتھ میں آنے کے بعد ان کا جو کچھ حوصلہ تھا یہ تھا کہ وہ اور ان کے ساتھ ساری رعایا جناب کی حلقہ بگوش ارادت بن جائے۔ لیکن ظاہر کہ علمائے دین ملت کو سیاست سے کسی قسم کا واسطہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اب یہ ہوا کہ ملک کی آمدنی سے لاکھوں روپیہ زکوٰۃ کے نام سے ان کی نذر کیا جانے لگا اور علاوہ ازیں اور بھی بہت سی خیرات کی رقمیں ان ہی کے ہاتھ میں جاتیں۔

امجد علی شاہ کے لئے تقوے طہارت کا خیال مرض بن گیا تھا۔ انہیں اپنے خیال کی پابندی شرع سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ نظم و نسق ملک کی طرف توجہ دیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ محمد علی شاہ نے اپنی تجربہ کاری اور بیدار مغزی سے جو کچھ انتظامات کئے تھے سب درہم برہم ہو گئے۔ اور حالت یہ ہو گئی کہ قاضی محمد صادق خان اختر کے بیان کے مطابق تمام عمال بدکار بد باطن اور خود غرض تھے۔ خزانہ خالی تھا۔ رشوت ستانی کی گرم بازاری تھی اور جو فتنے پیدا ہوتے مٹ نہ سکتے تھے۔

لیکن اس اتقا کی خاموشی اور تمدنی غفلت و بے پروائی پر بھی انہوں نے محلہ حضرت گنج آباد کیا جو آج لکھنؤ میں تمام محلوں سے زیادہ صاف ستھرا اور بارونق

ہے۔ انہوں نے لکھنؤ سے کانپور تک براہ راست ایک پختہ سڑک بنوائی۔ ان کے عہد میں سب سے بڑا کام یہ ہوا کہ لوہے کے پل کی عمارت بن کے تیار ہوگئی۔ اس پل کی تعمیر کا واقعہ یہ ہے کہ اس کے اجزا اور پرزے غازی الدین حیدر نے انگلستان سے منگوائے تھے۔ مگر وہ پرزے جب تک لکھنؤ پہنچے۔ بادشاہ راہی ملک عدم ہوا۔ ان کے بعد نصیر الدین حیدر سے بھی یہ کام نہ ہو سکا۔ مگر امجد علی شاہ نے اپنے عہد یہ پل بنوا کر مکمل کیا۔

لیکن جو لوہے کا پل آج قائم ہے وہ امجد علی شاہ کا نہیں۔ وہ ایک لٹکنے والا پل تھا۔ وہ جب خستہ ہوگیا تو بعد میں یہ پل بنایا گیا جو آج بھی موجود ہے۔ امجد علی شاہ ہی کے زمانے میں ان کے وزیر امین الدولہ نے امین آباد آباد کیا جس کی آبادی و رونق آج کل روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ امجد علی شاہ نے اپنے زمانے میں اگرچہ کچھ نہیں کیا اور نہ اپنے شوق سے کوئی ایسی عمارت بنوائی جو آج کل ان کی یادگار رہو۔ مگر شاید اپنے اتقا اور پرہیزگاری کے صلے میں انہیں یہ قدرتی ناموری حاصل ہوگئی کہ لکھنؤ کے آج کل کے سب سے زیادہ آباد اور مشہور محلے یعنی حضرت گنج اور امین آباد انہیں کے بنوائے ہوئے ہیں۔

آخر زمانے نے ان کے دور کا بھی ورق الٹ دیا۔ اور ۱۸۴۸ء میں جبکہ عمر ابھی پوری اڑتالیس برس اور کچھ ہی دن اوپر تھی کہ مرض سرطان میں مبتلا ہو کے دنیا سے رخصت ہوئے۔ اور اپنے آباد کئے ہوئے محلے حضرت گنج ہی چھاؤنی کے اندر دفن ہوئے۔ ان کا امام باڑہ جس میں وہ مدفون ہیں حضرت گنج کے مغربی حصے میں لب سڑک موجود ہے جس کی عمارت ان کی وفات کے بعد واجد علی شاہ نے دس لاکھ روپیہ صرف کر کے بنوائی تھی۔

واجد علی شاہ کا عہد

اب امجد علی شاہ کے بڑے بیٹے واجد علی شاہ تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے۔ ان کا زمانہ اس مشرقی دربار کی تاریخ کا آخری ورق اور اسی مرثیۂ داستان کا آخری بند ہے۔ چونکہ انتزاع سلطنت انہیں کے عہد میں ہوا اس لئے تمام اہل رائے کے ہدف اور نشانۂ ملامت وہی بن گئے اور قریب قریب تسلیم کر لیا گیا کہ زوال سلطنت کا باعث وہ تھے۔ لیکن جس زمانے میں ان کی سلطنت کا خاتمہ ہوا ہے ان دنوں ہندوستان کی تمام وطنی قوتیں ٹوٹ رہی تھیں اور بری بھلی سب طرح کی حکومتیں دنیا سے مٹتی جاتی تھیں۔ پنجاب میں سکھوں کا اور دکن میں مرہٹوں کا دفتر کیوں الٹا؟ جو بہادر اور زبردست اور ہوشیار مانے جاتے ہیں۔ دہلی میں شہنشاہی کا اور بنگالہ میں نواب ناظم بنگالہ کا کیوں استیصال ہوا؟ حالانکہ ان میں اتنی طفلانہ مزاجی نہ تھی جتنی کہ لکھنؤ کے بادشاہوں میں تھی۔

اصل بات یہ ہے کہ اس عہد میں ادھر اہل ہند کی غفلت و جہالت کا پیمانہ چھلکنے کے قریب پہنچ گیا تھا اور ادھر دولت برطانیہ کی قوت اور برٹش قوم کی عاقبت اندیشی اور جفاکشی روز بروز مستحکم ہوتی جا رہی تھی۔ غیر ممکن تھا کہ انگریزوں کی ذہانت فراست، ہوشیاری آگے بڑھ کر ہندوستان کی جہالت خود فراموشی اور خود غرضی پر فتح حاصل نہ کرتی۔ زمانے نے ساری دنیا میں تمدن کا نیا رنگ اختیار کیا تھا اور پکار پکار کے ہر ایک قوم سے کہہ رہا تھا کہ جو اس مذاق میں میرا ساتھ نہ دے گا لٹ جائے گا۔ زمانے کی یہ آواز ہندوستان میں کسی نے نہ سنی اور سب مٹ گئے ان ہی مٹنے والوں میں اودھ کی سلطنت بھی تھی جس کے زوال کا بوجھ واجد علی شاہ کے کندھوں پر ڈال دیا گیا۔

واجد علی شاہ کی تربیت

پابند شرع باپ نے واجد علی شاہ کو بھی علما کی صحبت میں رکھ کے اپنا سا بنانا چاہا تھا۔ اور یہ رنگ ایک حد تک واجد علی شاہ پر چڑھا بھی مگر عمر کے ساتھ ساتھ وہ اس رنگ سے دور ہوتے چلے گئے۔ امجد علی شاہ کا اس میں کچھ زور نہ چلا کہ وارث سلطنت فرزند کا فطری رجحان عیاشی اور فنون طرب و نشاط کی طرف تھا۔ اگرچہ باپ کی وجہ سے لکھنے پڑھنے کی تعلیم بھی اچھی تھی۔ لیکن موسیقی کا شوق غالب تھا۔ ولی عہدی ہی میں اپنے ذاتی شوق سے انہوں نے باپ کے منشا کے خلاف گویوں اور ڈھاڑیوں سے ربط و ضبط بڑھایا اور انجام یہ ہوا کہ جو لطف انہیں حسین عورتوں اور گویوں کی صحبت میں آتا۔ علمی مذاق کی صحبتوں میں نہ آتا۔

باپ کے خلاف انہیں عمارت کا بھی شوق تھا اور ولی عہدی ہی میں انہوں نے خاص اپنی محفل طرب اور عیش کے لئے ایک پرفضا باغ اور اس میں دو ایک مختصر خوبصورت۔ پرتکلف مکان بنوائے۔ علی نقی خاں جنہیں تخت پر بیٹھتے ہی مسند وزارت عطا کیا۔ ان سے زمانہ ولی عہدی میں ایک رنڈی کے گھر ملاقات ہوئی تھی۔ ان کی پرشباب شوخی مزاج نے واجد علی شاہ کو بڑا متاثر کیا اور اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وزارت اور انتظام ملک کے لئے ان سے زیادہ موزوں اور کوئی شخص نہیں۔

سلطنت کی ابتدا

واجد علی شاہ کی سلطنت کا آغاز تو اس عنوان سے ہوا کہ نوجوان بانکے بادشاہ کو عدالت گستری اور اصلاح فوج کی طرف غیر معمولی توجہ تھی۔ سواری میں آگے آگے دو نقرئی صندوقچے چلتے جس کسی کو کچھ شکایت ہوتی عرضی لکھ کے اس میں ڈال دیتا۔ کبھی خود بادشاہ کے پاس رہتی محل میں پہنچ کے حضور ان عرضیوں کو نکالتے اور اپنے ہاتھ سے احکام تحریر فرماتے۔ اس طرح کئی نئے رسالے اور کئی نئی پلٹنیں بھرتی ہوئیں۔ رسالوں کے نام اختری۔ نادری وغیرہ رکھے گئے۔ خود بادشاہ بہ نفس نفیس گھوڑے پر سوار ہو کے جاتے اور گھنٹوں دھوپ میں کھڑے ہو کے ان کی قواعد اور فنون جنگ میں ان کی مشاقی دیکھتے۔ اور خوش ہو ہو کے باکمال سپاہیوں کو انعام واکرام سے نوازتے۔ فوجی قواعد کے لئے خود ہی فارسی اصطلاحات اور کلمات مقرر کئے راست رو۔ پس بیا۔ دست چپ بگرد وغیرہ۔ چند روز بعد نوجوان حسین عورتوں کی ایک چھوٹی زنانی فوج مرتب کی گئی اور ان کو بھی انہیں اصطلاحوں میں قواعد سکھائی گئی۔

شاعری کی طرف

مگر جدید عہد کا یہ نقش اولین چند روزہ تھا۔ پورا ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ طبیعت ان چیزوں سے اکتا گئی زمانہ ولی عہدی کا وہی پرانا مذاق پھر سے عود کر آیا حسین اور آوارہ عورتوں سے صحبت بڑھی۔ ارباب نشاط کا بازار گرم ہوا اور تھوڑے ہی دنوں میں ڈوم ڈھاڑی ہی ارکان دولت اور معززین سلطنت تھے۔ بادشاہ کے دل میں اب کوئی علمی اور شریفانہ مذاق باقی تھا تو وہ شاعری تھی کیونکہ خود شعر کہتے اور شاعروں کی قدر کرتے۔

اس عہد کے شعرا

لکھنؤ میں ان دنوں شاعری کا چرچا حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ اکیلے لکھنؤ میں اتنے شاعر موجود تھے

کہ اگر سارے ہندوستان کے شعرا جمع کئے جاتے تو ان کی تعداد لکھنؤ کے شاعروں سے نہ بڑھ سکتی۔ میرؔ اور سوداؔ کی پرانی شاعری تقویم پارینہ ہو چکی اب ناسخؔ کی زبان اور آتشؔ کے خیالات دماغوں میں بسے ہوئے تھے جن میں رندؔ و صباؔ کے رندانہ کلام اور نواب مرزا شوقؔ کی مثنویوں نے شہرت میں سب پر سبقت حاصل کر لی تھی اور اسی مذاق کو بادشاہ کی طبیعت کا اصلی رنگ چاہتا اور پسند کرتا تھا۔ اسلامی شاعری کا رنگ خلافت اسلامیہ کی پہلی صدی تک تو یہ تھا کہ شاعر ایک خاص عورت پر عاشق ہوتے۔ اس کا نام لے لے کے اس کے حسن کی خوبیوں اور اس کی اداؤں کی دل فریبی کو بیان کرتے۔ اور اس کی طرف خطاب کر کر کے اپنی بے تابیوں اور بے قراریوں کو ظاہر کرتے۔ اکثر چھپ چھپ کے اس سے ملتے۔ مگر تہذیب و عفت کے دائرے سے کبھی قدم باہر نہ نکالتے۔ چند روز بعد عرب ہی میں معشوق گمنام ہو گیا۔ اور عموماً شعرا کے معشوق ان کے خیال کا ایک پتلا بن گئے۔ جسے رند مشرب تو کوئی حسین عورت یا کوئی خوبرو لڑکا بناتے مگر صوفی تھوڑی سی معنوی تاویل کر کے اسے اپنا حسین مطلق یعنی خلاق عالم بنا دیتے ——

یہی سمویا ہوا مذاق رندی فارسی میں بھی رہا۔ اور یہی مذاق اس وقت تک اردو شاعری کا بھی تھا۔ مگر نواب مرزا شوق نے اپنی شاعری کو حسین پردہ دار عورتوں پر عاشق ہو کے ان کے خراب کرنے کا آلہ بنایا اور قیامت یہ تھی کہ ان کی مثنویوں کی زبان ایسی خوبصورت۔ بے تکلف اور شستہ و رفتہ تھی اور ان میں عاشقانہ جذبات اس کثرت سے بھر دیئے گئے تھے کہ مہذب و شائستہ لوگوں سے بھی بے دیکھے اور مزہ لئے نہ رہا جاتا ——

واجد علی شاہ بطور شاعر

واجد علی شاہ نے بھی ان مثنویوں کو دیکھا اور چونکہ خود شاعر تھے اس رنگ کو اختیار کر کے اپنے بہت سے معاشقوں اور عنفوان شباب کی صدہا رندانہ بے اعتدالیوں کو خود ہی موزوں کر کے ملک میں پھیلا دیا اور اخلاقی دنیا میں اقراری مجرم بن گئے۔ بادشاہ تو بادشاہ وزرا اور امرا میں بھی ان کے عہد میں شاذ و نادر ہی ایسے گزرے ہوں گے جنہوں نے عنفوان شباب میں اپنی ہوس پرستیوں کی انتہا کر دی ہو۔ مگر واجد علی شاہ کی طرح کسی نے اپنے ان بے شرمی کے جرائم کو خود ہی پبلک کے سامنے پیش نہیں کیا تھا۔

واجد علی شاہ زور میں آئے تو چاہے شاعری میں نہ بڑھ سکیں مگر اپنے جذبات و خیالات اور اپنے کارناموں کے عالم آشکارا کرنے میں نواب مرزا سے بھی دو قدم آگے نکل گئے اور یہاں تک ترقی کی کہ بعض موقعوں پر انہیں مبتذل بازاری مذاق اور فحش الفاظ کے استعمال میں بھی تامل نہ رہا۔ وہ کہاریوں۔ رنڈیوں۔ خواصوں۔ محل میں آنے جانے والی عورتوں۔ غرض صدہا عورتوں پر عاشق ہوئے اور چونکہ ولی عہد تھے۔ اپنے عشق میں خوب کامیاب رہے۔ جن کی شرمناک داستانیں ان کی نظموں تحریروں اور تصنیفات میں خود ان کی زبان سے سن لی جا سکتی ہیں اور یہی سبب ہے کہ تاریخ میں ان کا کردار سب سے زیادہ ناپاک اور بھیانک نظر آتا ہے۔

چونکہ عمارت کا بے حد شوق تھا اس لیے تخت نشین ہوتے ہی قیصر باغ کی عمارت بنوانا شروع کر دی۔ جو چاہے آصف الدولہ کی عمارتوں کی طرح مضبوط نہ ہو مگر خوبصورتی اور عظمت میں لاجواب ہے۔ اس میں بہت سی خوشنما اور شان و شوکت والی دو منزلہ عمارتوں کا ایک مربع مستطیل رقبہ دور تک چلا گیا ہے سال میں ایک مرتبہ قیصر باغ میں ایک عظیم الشان میلہ ہوتا جس میں پبلک کو بھی قیصر باغ میں آنے اور جہاں پناہ کی عشرت پرستیوں کا رنگ دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ بادشاہ نے کرشن کا رہس جو ہندوؤں میں مروج ہے دیکھا تھا اور سری کرشن جی کی معشوقانہ ادائیں اس قدر پسند آئیں کہ اس رہس سے ڈراما کے طور پر ایک کھیل ایجاد کیا تھا۔ جس میں خود کنہیا بنتے اور لڑکیاں گوپیاں بنتیں۔ اور ناچ رنگ کی محفلیں گرم ہوتیں۔ کبھی جوش جوانی کے جذبات سے جوگی بن جاتے۔ موتیوں کو جلا کے بھبھوت بنائی جاتی جس کی بدولت فقیری میں بھی شاہی کے کرشمے نظر آتے۔ میلے کے زمانے میں ان صحبتوں میں شریک ہونے کی عام اہل شہر کو اجازت ہوتی۔ مگر اس شرط پر کہ گیروے کپڑے پہن کے آئیں۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسی اسی برس کے بڈھے بھی گیروی کپڑے پہن کے چھیلا بن جاتے۔

یہی رنگ چلا جاتا تھا اور لکھنؤ میں کمال بے فکری کے ساتھ رنگ رلیاں منائی جا رہی تھیں کہ سرکار برطانیہ کو یہاں کے ریذیڈنٹ نے آگاہ کیا اور وہاں کے بورڈ نے یہ فیصلہ دیا کہ ملک اودھ کو سلطنت برطانیہ میں شامل کیا جائے۔ اس حکم کی تکمیل کے لئے انگریزی فوج لکھنؤ میں آئی اور یکایک خلاف توقع بادشاہ کو حکم سنایا گیا کہ ——

"آپ کا ملک انگریزی ممالک محروسہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ آپ کے لئے بارہ لاکھ روپیہ سالانہ اور آپ کے جلوسی لشکر کے لئے تین لاکھ روپیہ سالانہ رقم جو آپ کی اور وابستگان دامن کی ضرورتوں کے لئے بخوبی کافی ہے۔ مقرر کی گئی۔ اور آپ کو اجازت ہے کہ شہر کے اندر آرام سے بے فکرے بن کے بیٹھیں اور رعایا کی فکروں سے آزاد ہو کے بے غل و غش رنگ رلیاں منائیں۔"

یہ احکام سنتے ہی شہر میں سناٹا ہو گیا۔ خود بادشاہ نے رو رو کے بہت کچھ عذر خواہی کی۔ بادشاہ کی ماں اور خاص محل نے حق وکالت ادا کیا۔ مگر گورنر جنرل کے حکم میں رد و بدل نہ کیا گیا۔

لکھنؤ پر کمپنی کا قبضہ

چنانچہ اس حکم کے ساتھ ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے بغیر کسی مزاحمت کے ملک اودھ پر قبضہ کر لیا۔ اور بادشاہ مع اپنی والدہ۔ ولی عہد۔ خاص خاص محلات اور جان نثار رفقا کے کلکتے روانہ ہوئے کہ انگلستان جا کے اپیل کریں اور اپنی بے گناہی ثابت کر کے حکم کو منسوخ کرائیں۔

واجد علی شاہ کی یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ تاج و تخت سے جدا ہوتے ہی آخر ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ چھوڑ کے کلکتے کی طرف روانہ ہو گئے۔ تاکہ اپنے معاملے میں باضابطہ پیروی کریں اور گورنر جنرل ہند کے دربار سے کامیابی نہ ہو تو لندن پہنچ کے مقدمے کو پارلیمنٹ اور ملکہ انگلستان کے سامنے پیش کریں۔ چنانچہ کلکتے میں کام نہ نکلا تو انگلستان کا ارادہ کیا۔ مگر حکیموں نے بحری سفر کو بادشاہ کے لئے نقصان دہ قرار دیا اور مشیروں نے روکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود بادشاہ تو کلکتے میں ٹھہر گئے مگر اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ ولی عہد کو انگلستان روانہ کر دیا۔

غدر کا آغاز

واجد علی شاہ کلکتے میں تھے۔ ان کا خاندان لندن میں تھا اور معاملہ زیر غور تھا کہ یکایک ملک میں غدر مچ گیا اور کارتوسوں کے جھگڑوں سے مسلح افواج اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرٹھ سے بنگال تک ایسی آگ لگی کہ

اپنے پرائے سب کے گھر جل اٹھے۔ ہندوستان میں برطانوی استبداد کی بنیادیں لرز کر رہ گئیں۔ جس طرح میرٹھ کے باغی ہر طرف سے سمٹ کر دہلی میں جمع ہوئے تھے اور بہادر شاہ ظفر کو ہندوستان کا شہنشاہ بنایا تھا ویسے ہی الہ آباد و فیض آباد کے باغی مئی ۱۸۵۷ء میں جوش و خروش کے ساتھ لکھنؤ پہنچے۔ ان کے آتے ہی یہاں کے بھی لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور شاہی خاندان کا کوئی رکن نہ ملا تو واجد علی شاہ کے ایک دس برس کے نابالغ بچے مرزا برجیس قدر کو تخت پر بٹھا دیا۔ اور ان کی ماں حضرت محل سلطنت کی مختار کل بن گئیں۔ تھوڑی سی انگریزی فوج جو یہاں تھی اور اس کے ساتھ یہاں کے تمام یورپی عہدیداران جو بچ گئے تھے وہ بیلی گارد میں قلعہ بند ہو گئے۔ جس کے گرد باغیوں کے پہنچنے سے پہلے ہی دھسّں بنا لئے گئے تھے۔ اور حفاظت و بسر کا کافی بندوبست کر لیا گیا تھا۔ غنیمت ہوا۔ یا یہ کہیئے کہ قسمت اچھی تھی کہ واجد علی شاہ لکھنؤ سے جا چکے تھے۔ ورنہ وہی خواہ مخواہ بادشاہ بنائے جاتے۔ ان کا حشر بہادر شاہ ظفر سے بھی بدتر ہوتا۔ اور اودھ کے پریشاں بختوں کو ذرہ پہنچنے کے لئے مٹیا برج کے دربار کا جو ایک عارضی سہارا مل گیا تھا یہ بھی نہ نصیب ہوتا۔

اب لکھنؤ میں انگریزوں کی باغی فوج کے علاوہ اودھ کے اکثر زمیندار و تعلقہ دار اور عہد شاہی کے برطرف شدہ سپاہی کثرت سے جمع تھے اور ان میں شہر کے بہت سے آوارہ لوگوں اور ہر طبقے کے لوگوں کا طوفان بے تمیزی بھی شریک ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑے سے انگریزوں پر ایک زبردست حملہ ہے۔ مگر محاصرہ کرنے والوں میں سے کوئی بھی اصول جنگ سے واقف نہیں تھا اس کے برعکس انگریز جدید اصول جنگ سے بخوبی واقف تھے۔ اب لکھنؤ میں برجیس قدر کا زمانہ اور حضرت محل کی حکومت تھی۔ برجیس قدر کے نام کا سکہ جاری ہوا۔ سلطنت کے عہدہ دار مقرر ہوئے۔ ملک سے تحصیل وصول ہونے لگی اور صرف تفنن طبع کے طور پر محاصرے کی کارروائی بھی جاری رہی لوگ حضرت محل کی مستعدی اور نیک نفسی کی تعریف کرتے۔ وہ سپاہیوں کی نہایت قدر کرتی اور ان کے کام اور حوصلے سے زیادہ انعام دیتی۔ مگر اس کا کیا علاج کہ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خود پردے سے نکل کے فوج کی سپہ سالاری کرتیں مشیر اچھے نہ تھے اور سپاہی کام کے نہ تھے۔ ہر شخص غرض کا بندہ تھا۔ اور کوئی کسی کا کہنا نہ مانتا تھا۔ انگریزی فوج کے باغی اس غرور میں تھے کہ یہ فقط ہمارے دم کا ظہور ہے۔ اصلی حاکم ہم ہیں۔

احمد اللہ نام کے ایک شاہ صاحب جو فیض آباد کے حریت پسندوں کے ساتھ آئے تھے۔ وہ کئی معرکوں میں لڑ چکے تھے۔ وہ الگ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کھڑی کر رہے تھے۔ بلکہ وہ خود اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ برجیس قدر کے مقابل لکھنؤ میں ہی ان کا دربار الگ قائم تھا اور دونوں درباروں میں پولیٹیکل اختلافات کے ساتھ شیعہ سنی کا جھگڑا اور تعصب بھی نمایاں ہونے لگا۔ غرض بادشاہ اور شاہ صاحب میں رقابت بڑھتی چلی گئی آخر اسی سال نومبر کے مہینے میں برجیس قدر کی تخت نشینی کو چھ سات مہینے ہوئے تھے کہ انگریزی فوج لکھنؤ پر تسلط کرنے کے لئے آ گئی۔ جس کے ساتھ پنجاب کے سکھ اور بھوٹان کے پہاڑی بھی تھے۔ اور کہا جاتا ہے کہ ان ہی لوگوں نے زیادہ ظلم کئے۔ تین دن کی گولہ باری میں نئی سلطنت کا جو نقش قائم ہوا تھا مکڑی کے جالے کی طرح ٹوٹ کر رہ گیا۔ ہزارہا مفرورین کے ساتھ حضرت محل اور برجیس قدر نیپال کی طرف بھاگ گئے۔ شاہ صاحب نے دو تین دن لڑ لڑ کے اگرچہ برجیس قدر کے لئے آزادی سے بھاگنے کا موقع پیدا کر دیا مگر خود اپنی جان نہ بچا سکے شکست کھا کے بھاگے اور کسی نے گولی مار دی اور شہید ہو گئے۔

لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے لئے انگریزوں نے شہر میں سخت گولہ باری کی۔ عورت مرد گھر چھوڑ کر بھاگ گئے اور ایک ایسی قیامت بپا ہوئی کہ جن لوگوں نے دیکھا ہے آج تک یاد کر کے کانپ جاتے ہیں۔ محلوں کی بیٹھنے والیاں کہ جن کی صورت کبھی آفتاب نے نہ دیکھی تھی جنگلوں کی خاک چھانتی پھرتی تھیں۔ بے کسی میں ایک ایک کا دامن پکڑتی تھیں اور جو ملتا تھا دشمن ہی ملتا تھا۔ اسی حالت میں انگریزی فوج نے شہر کو خوب لوٹا اور خدا خدا کر کے وہ دن بھی آیا کہ لوگوں کو پھر سے اپنے گھروں میں جانے کا حکم ملا۔ بڑے بڑے دولت مند اور معزز گھرانوں کے پامال و تباہ ہونے کا سلسلہ مدت تک برابر جاری رہا۔ محلے کے محلے اجڑتے چلے گئے اور خاندان کے بعد خاندان مٹتے چلے گئے۔ اکثر لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ چند روز کے بعد لکھنؤ کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔

مٹیا برج

کلکتے سے تین چار میل کے فاصلے پر جنوب کی طرف دریائے بھاگیرتی (ہوگلی) کے کنارے گارڈن ریچ نام ایک خاموش محلہ ہے اور چونکہ وہاں ایک مٹی کا تودہ سا تھا اس لئے عام لوگ اسے مٹیا برج کہتے تھے۔ یہاں کئی عالیشان کوٹھیاں تھیں جن کی زمین دریا کے کنارے کنارے تقریباً دو ڈھائی میل تک چلی گئی تھی۔ جب واجد علی شاہ کلکتے پہنچے تو گورنمنٹ آف انڈیا نے یہ کوٹھیاں انہیں دے دیں۔ دو خاص بادشاہ کے لئے ایک نواب محل کے واسطے اور ایک علی نقی خاں کی سکونت کے واسطے جو بادشاہ کے ساتھ تھے اور ان کے گرد زمین کا ایک بڑا قطعہ جو عرض میں دریا کے کنارے سے تقریباً ڈیڑھ میل تک چلا گیا تھا اور اس کا حلقہ چھ سات میل سے کم نہ ہوگا بادشاہ کو اپنے ملازمین کے قیام کے لئے دیا گیا۔ میونسپلٹی کی سڑک اس رقبے کو طولاً قطع کرتی تھی۔ وہ دو کوٹھیاں جو بادشاہ کو دی گئی تھیں ان کے نام بادشاہ نے سلطان خانہ اور اسد منزل قرار دیئے اور نواب خاص محل کی کوٹھی پر بھی جب بادشاہ نے قبضہ کر لیا تو اس کا نام مرصع منزل رکھا اور علی نقی خان کی کوٹھی آخر تک انہی کے قبضے میں اور ان کے بعد ان کی اولاد خصوصاً نواب اختر محل کے قبضے میں رہی جو علی نقی خاں کی بیٹی اور بادشاہ کے دوسرے ولی عہد مرزا خوش بخت بہادر کی ماں تھیں۔

انگریزوں نے فیصلہ کیا کہ کہیں کلکتے میں بھی آزادی کا شعلہ نہ بھڑک اٹھے اس لئے بادشاہ کو مٹیا برج سے نکال کر فورٹ ولیم میں رکھا جائے۔ لندن میں ان کی جانب سے جو مقدمہ پیش تھا وہ اس بنا پر ملتوی کر دیا گیا کہ جس ملک کے لئے یہ دعویٰ ہے وہ اب ہمارے قبضے میں نہیں۔ بادشاہ اس حراست میں تھے کہ لکھنؤ پر انگریزی فوج کا قبضہ ہو گیا اور نصیر الدین خان نے جو لندن میں بادشاہ کے مختار عام تھے اپنا دعویٰ پھر سے پیش کر دیا۔ بادشاہ کے مشیروں نے کسی خاص مصلحت کے پیش نظر بادشاہ کو سمجھانا شروع کر دیا کہ جہاں پناہ! انگریز ملک واپس نہیں دیں گے۔ بھلا کسی نے ملک لے کر واپس بھی دیا ہے؟ مسیح الدین خان نے حضور کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ ہونا ہوانا کچھ نہیں ہے

اور جہاں پناہ مفت میں تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ ڈیڑھ دو برس سے تنخواہ نہیں لی ہے۔ ہر بات کی تنگی ہے اور ہم ملازمان دولت بھی پیسے پیسے کو محتاج ہیں مناسب یہ ہے کہ سرکار انگریزی کی تجویزوں کو قبول کر لیں اور تنخواہ وصول کرکے اطمینان و فارغ البالی سے اپنے محلات عالیات اور آستان بوستان دولت کے ساتھ بسر فرمائیں۔

بادشاہ کو خرچ کی تنگی تھی اور بادشاہ سے زیادہ ان کے رفقا پریشان تھے مصاحبوں نے بار بار تجویز پیش کی تو بلا تکلف ویسرائے کو لکھ بھیجا۔

"مجھے سرکار انگریزی کی مجوزہ ماہوار لینا منظور ہے۔ لہٰذا میری اس وقت تک کی تنخواہ ادا کی جاوے۔ اور مقدمہ جو لندن میں دائر ہے خارج کیا جاوے۔"

جواب ملا ـــ

"اب آپ کو اول تو گذشتہ ایام کی ماہوار نہ دی جائے گی۔ صرف اسی وقت سے ماہوار جاری ہوگی۔ دوسرے فقط بارہ لاکھ روپے سالانہ دیئے جائیں گے۔ اور جو تین لاکھ روپیہ سالانہ آپ کے ملازمین کے لئے تجویز کئے گئے تھے اب ان کے دینے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔"

شاید بادشاہ اس نقصان کو گوارا نہ کرتے مگر مصاحبوں نے اس پر بھی راضی کر دیا اور انگریزوں نے لندن میں اطلاع کر دی کہ واجد علی شاہ نے گورنمنٹ کی تجویز منظور کر لی ہے۔ لہٰذا اس کا مقدمہ خارج کیا جائے۔

بادشاہ کے ماہوار پر راضی ہو جانے کی خبر جیسے ہی لندن پہنچی مسیح الدین خاں کے حواس جاتے رہے۔ بادشاہ کی ماں، ان کے بھائی اور ولی عہد نے سر پیٹ لیا اور حیران تھے کہ یہ کیا غضب ہو گیا۔ افسوس اس وقت تک کا سب کیا دھرا خاک میں ملا جاتا ہے آخر مسیح الدین خاں نے سوچتے سوچتے ایک بات پیدا کی۔ اور پارلیمنٹ میں یہ قانونی عذر پیش کیا کہ بادشاہ فی الحال گورنمنٹ آف انڈیا کی حراست میں ہیں اور ایسی حالت میں ان کی کوئی تحریر پایہ اعتبار کو نہیں پہنچ سکتی۔ عذر معقول تھا تسلیم کیا گیا اور گورنمنٹ آف انڈیا کو بادشاہ کے مختار کی عذرداری سے مطلع کر دیا گیا۔ ساتھ میں مسیح الدین خاں اور تمام ارکان خاندان شاہی نے بادشاہ کو لکھا کہ یہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں۔ ہمیں ملک اودھ کے واپس ملنے کی پوری امید ہے اور غدر فرد ہو چکا تھا۔ انگریزی حکومت نے بادشاہ کو چھوڑ دیا اور وہ خوشی خوشی قلعے سے نکل کے مٹیا برج میں آئے اور آزادی حاصل ہوتے ہی مصاحبوں نے عرض کیا۔ "حضور! مسیح الدین خاں لندن میں یہ کہہ رہے ہیں کہ جہاں پناہ نے تنخواہ لینے کو صرف قید ہونے کی وجہ سے منظور کر لیا ہے۔ یہ سنتے ہی بادشاہ برافروختہ ہوئے اور اسی وقت لکھ بھیجا کہ ہم نے آزادی سے بہ رضا و رغبت گورنمنٹ کی تجویز کو منظور کیا ہے اور مسیح الدین کا یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ ہم نے قید میں ہونے یا کسی جبر و تشدد کی وجہ سے منظوری دی ہے۔ لہٰذا ہم آئندہ کے لئے اس مختار نامے ہی کو منسوخ کرتے ہیں جس کی رو سے وہ ہمارے مختار عام بنائے گئے ہیں ـــ"

اب کیا تھا؟ ساری کارروائی ختم ہو گئی۔ بادشاہ مٹیا برج میں رنگ رلیاں منانے لگے۔ مصاحبوں کے گھروں میں سن برسنے لگا اور شاہی خاندان کا شکستہ حال قافلہ لندن میں پڑا ہوا تھا۔ قریب قریب وہیں تباہ ہو گیا۔ اکثر ہمراہیوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ بادشاہ کی ماں جناب عالیہ اس صدمے سے بیمار ہو گئیں اور اسی بیماری میں چلیں کہ فرانس سے ہوتی ہوئی مقامات متبرکہ میں جائیں اور ان کی زیارت سے شرف یاب ہو کے کلکتہ پہنچیں۔ مگر موت نے پیرس سے آگے قدم نہ بڑھانے دیا۔ وہیں انتقال کیا اور عثمانی سفارت خانہ فرانس کی مسجد کے متصل مسلمانوں کا ایک قبرستان ہے اس میں دفن ہوئیں۔ مرزا سکندر حشمت کو ماں کے مرنے کا اس قدر صدمہ ہوا کہ ماں کے مرتے ہی خود بھی بیمار پڑ گئے اور ماں کے چودہ پندرہ روز بعد وہ بھی مر گئے اور وہیں ماں کے برابر میں دفن ہوئے۔ اکیلے مرزا ولی عہد کلکتہ واپس آ کے ماں باپ سے ملے۔

کہتے ہیں کہ مٹیا برج میں بادشاہ کی شروع شروع کی زندگی بیدار مغزی اور ہوشیاری کی زندگی تھی۔ یہ حالت دیکھ کے گرد و پیش کے لوگوں نے چند آلات موسیقی فراہم کر دیئے۔ اور ارباب نشاط کا گروہ وہاں جمع ہونے لگا۔ ہندوستان کے اچھے اچھے گویے آ کے وہاں ملازم ہوئے اور مٹیا برج میں موسیقی دانوں کا ایسا مجمع ہو گیا تھا کہ کسی اور کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ خوبصورت عورتوں کے جمع کرنے اور حسن و شوق کے کرشموں میں پھنسے رہنے کا وہاں بھی ویسا ہی شوق تھا جیسا کہ لکھنؤ میں سنا جاتا تھا۔ مگر مٹیا برج میں اس شوق میں مذہبی احتیاط کا پورا لحاظ رہتا۔ بادشاہ شیعہ تھے اور شیعوں کی شرع میں متعہ بغیر کسی تحدید اور روک کے جائز ہے۔ اس مذہبی آزادی سے فائدہ اٹھا کے بادشاہ جی بھر کے اپنا شوق پورا کر لیتے اور قاعدہ تھا کہ غیر ممتوعہ عورت کی صورت تک دیکھنا گوارا نہ کرتے۔ یہ احتیاط اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ ایک نوجوان حبشن جو بادشاہ کے سامنے زنانے میں پانی لاتی اس سے بھی متعہ کر کے اسے نواب آب رسان بیگم کا خطاب دے دیا۔ ایک جوان خاک روبن جس کی حضوری میں آمد و رفت تھی وہ بھی ممتوعہ میں داخل ہو کے نواب مصفا بیگم کے خطاب سے سرفراز ہوئی۔ اسی طرح موسیقی کا شوق بھی ممتوعات ہی تک محدود رہتا۔ شاید شاذ و نادر ہی اس کا اتفاق ہوا ہوگا کہ بادشاہ نے کبھی کسی بازاری طوائف کا مجرا دیکھا ہو۔ خود ممتوعات کی مختلف پارٹیاں بنا دی گئی تھیں جن کو مختلف طرز پر رقص و سرود کی تعلیم دی جاتی۔ ایک رادھا منزل والیاں۔ ایک جھومر والیاں۔ ایک لٹکن والیاں۔ ایک سار دھا منزل والیاں۔ ایک نتھ والیاں۔ ایک گھونگھٹ والیاں۔ ایک رہس والیاں۔ ایک نقل والیاں اور اسی طرح کے بیسیوں گروہ تھے جن کو رقص و سرود کی اعلیٰ تعلیم دی گئی۔'

ان ہی کے ناچ گانے میں واجد علی شاہ کا دل بہلتا۔ ان سب سے متعہ ہو گیا تھا۔ بیگمیں کہلاتی تھیں اور دو ایک گروہوں میں اگر چند کمسن و نابالغ لڑکیاں غیر ممتوعہ تھیں تو اس لئے تھیں کہ بعد بلوغ داخل ممتوعات کر لی جائیں گی۔ ان میں سے اکثر خود بادشاہ کے قریب خاص سلطان خانے میں رہتیں اور بعض کو دوسری کوٹھیوں میں جدا محل سرائیں ملی تھیں۔ ان ممتوعات میں سے جو صاحب اولاد ہو جاتیں ان کو محل کا خطاب دیا جاتا۔ رہنے کو جداگانہ محل سرا ملتی اور ان کی تنخواہ اور عزت بڑھ جاتی۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ موسیقی کے سوا اور تمام جنبشوں سے بادشاہ پرہیزگار تھے۔ نماز کبھی قضا نہ ہوتی۔ تیسوں روزے رکھتے تھے۔ افیون۔ شراب خلک سیر یا کسی قسم کے نشے سے زندگی بھر احتراز رہا۔ اور محرم کی عزاداری

نہایت ہی خلوص عقیدت سے بجالاتے تھے۔ تیسرا شوق انہیں عمارت کا تھا۔

لکھنؤ کی معاشرت اختر پیا کے دور میں

واجد علی شاہ شاعری میں اختر پیا تخلص کرتے تھے۔ انہیں عمارتیں بنوانے کا بھی بے حد شوق تھا۔ سلطان خانہ کے اردگرد کئی محل سرائیں تعمیر اور کوٹھیاں بنوائیں۔ ان کے ماسوا باغوں کے اندر تالابوں کے کنارے بہت سے کمرے۔ بنگلے اور چھوٹی چھوٹی کوٹھیاں تھیں جہاں صاف ستھرا پر تکلف فرش بچھا رہتا اور چاندی کے پلنگ لگے رہتے۔ تصویریں اور ہر طرح کا فرنیچر آراستہ ہوتا۔ لکھنؤ میں تو بادشاہ نے صرف قیصر باغ اور اس کے پاس کی چند عمارتیں یا اپنے والد مرحوم کا امام باڑہ اور مقبرہ ہی تعمیر کیا تھا۔ مگر مٹیا برج میں نفیس اور اعلیٰ عمارتوں کا ایک خوب صورت شہر بسا دیا۔ دریا کے اس پار مٹیا برج کے عین مقابل کلکتے کا مشہور بوٹینکل گارڈن ہے۔ مگر وہ مٹیا برج کی جنت کے آگے ہیچ لگنے لگا۔ دنیا میں عمارت کے شوقین ہزاروں بادشاہ گزرے ہیں مگر غالباً واجد علی شاہ سے بڑھ کر عمارتیں کسی نے نہیں بنوائیں جبکہ یہ زمانہ ان کا شاہی کا زمانہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ انگریزوں کے تنخواہ تھے اور بے کسی کی حالت میں تھے۔ ہزار کے قریب پہرے کے سپاہی تھے۔ جن کی تنخواہیں عموماً چھ روپیہ ماہوار تھیں۔ بعض بعض آٹھ یا دس روپے بھی پاتے۔ یہی تنخواہ مکان داروں کی تھی جن کا شمار پانچ سو سے زیادہ تھا۔ مالیوں کی بھی یہی تنخواہ تھی اور ان کا شمار بھی پانچ سو سے زیادہ تھا۔ تقریباً اسی اہل قلم یعنی محرر تھے جو تین سے دس روپیہ ماہوار تک تنخواہ پاتے تھے۔ ان کے علاوہ بیسیوں چھوٹے چھوٹے محکمے تھے۔ باورچی خانہ۔ آبدار خانہ۔ ٹھنڈی خانہ۔ خس خانہ اور خدا جانے کیا کیا تھا۔ ان سب لوگوں نے کوٹھیوں کے رقبے سے باہر زیادہ تر اسی زمین پر بادشاہ کو دی گئی تھی۔ اور بہتوں نے پاس کی دوسری زمینوں پر مکان بنا لئے تھے اور ایک شہر بس گیا تھا۔ جس کی مردم شماری چالیس ہزار سے زیادہ تھی۔ ان سب کی زندگی بادشاہ کی تنخواہ کے ایک لاکھ روپیہ ماہوار سے وابستہ تھی اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اتنی خلقت عظیم اس تھوڑی سی زمین میں کیونکر زندگی بسر کر لیتی ہے۔ بنگال کے عوام میں یہ مشہور تھا۔ کہ بادشاہ کے پاس پارس پتھر ہے۔ جب ضرورت ہوتی ہے۔ لوہے یا تانبے کو اس میں رگڑ کے سونا بنا لیا کرتے ہیں۔ حقیقت حال یہ ہے۔ کہ بادشاہ کے قیام سے کلکتے کے پڑوس میں ایک دوسرا لکھنؤ آباد ہو گیا تھا۔ اصلی لکھنؤ مٹ گیا تھا اور اس کی منتخب صحبت مٹیا برج میں چلی گئی تھی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے۔ کہ ان دنوں لکھنؤ لکھنؤ نہیں رہا تھا۔ مٹیا برج لکھنؤ تھا۔ یہی چہل پہل تھی۔ یہی زبان تھی۔ یہی شاعری تھی۔ یہی صحبتیں اور بذلہ سنجیاں تھیں۔ یہیں کے علما و اتقیا تھے۔ یہیں کے امرا و رؤسا تھے۔ اور یہیں کے عوام تھے۔ کسی کو نظر ہی نہ آتا تھا۔ کہ ہم بنگالے میں ہیں۔ یہی پتنگ بازیاں تھیں۔ یہی مرغ بازیاں تھیں۔ یہی بٹیر بازیاں تھیں یہی افیونی تھے۔ یہی داستان گوئی تھی۔ یہی تعزیہ داری تھی۔ یہی مرثیہ خوانی و نوحہ خوانی تھی۔ یہی امام باڑے تھے۔ یہی کربلا تھی۔ بلکہ جس جلوس اور شان و شوکت سے بادشاہ کی ضریح اٹھتی تھی۔ لکھنؤ میں عہد شاہی میں شاید اٹھ سکی ہو۔ غدر کے بعد تو کبھی کوئی تعزیہ نہیں اٹھ سکا۔ کلکتے کی ہزارہا خلقت اور انگریز تک زیارت کو مٹیا برج میں آجاتے تھے۔

بادشاہ اگر شیعہ تھے۔ مگر مزاج میں مطلق تعصب نہ تھا۔ ان کا پرانا مقولہ تھا "کہ میری دو آنکھوں میں سے ایک شیعہ ہے۔ اور ایک سُنی ہے"

ایک بار دو شخصوں میں مذہبی اختلاف پر مار پیٹ ہو گئی۔ بادشاہ نے دونوں کی معزولی کا حکم دیا۔ بلکہ اپنے وہاں ممنوع الملازمہ کر دیا۔ اور فرمایا۔ ایسے لوگوں کا میرے یہاں گزر نہیں ہو سکتا۔ آخر آخر میں بادشاہ کی ایک کتاب میں بعض ایسے ناگوار الفاظ چھپ گئے تھے۔ جن پر کلکتے کے سُنیوں میں بڑی شورش ہوئی۔ مگر اس سے لوگ واقف نہیں ہیں۔ کہ وہ الفاظ اصل کتاب میں نہیں بلکہ دوسروں کی تاریخ یا تقریظ میں تھے۔ اور بادشاہ کو جیسے ہی اطلاع ہوئی بغیر کسی تحریک کے معافی مانگنے کو تیار ہو گئے۔ بے تعصبی کا اس سے زیادہ ثبوت کیا ہوگا؟ کہ سارا انتظامی کاروبار سُنیوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ وزیر اعظم منور الدولہ بہادر سُنی تھے۔ منشی السلطان جو ایک زمانے میں سب سے زیادہ مقرب تھے سارے جانور خانے۔ کل اہل قلم اور کئی اور محکموں کے افسر اعلیٰ تھے سُنی تھے۔ بخشی امانت الدولہ بہادر جن کے ہاتھ سے کل ملازموں حتیٰ کہ محلوں اور شہزادوں تک کو تنخواہ ملتی تھی۔ سُنی تھے۔ عطارد الدولہ اور داروغہ معتبر علی خان جو آخر میں سب سے بڑے عہدہ دار اور کل کاروبار کے مالک تھے دونوں سُنی تھے۔ اس سے بڑھ کے کیا ہوگا؟ کہ امام باڑہ سبطین آباد کا اور محل کے خاص امام باڑے بیت البکا کا انتظام اور مجلسوں اور مذہبی تقریبوں کے بجالانے کا انصرام بھی سُنیوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ وہاں کبھی کسی نے اس کو محسوس ہی نہیں کیا۔ کہ کون سُنی ہے اور کون شیعہ ہے۔

مٹیا برج کے دکاندار اور مہاجن تک لکھنؤ کے تھے اور لکھنؤ کی کوئی چیز نہ تھی۔ جو مکمل ترین صورت میں وہاں موجود نہ ہو۔ جدھر گزر جائیے۔ ایک عجیب رونق اور چہل پہل نظر آتی۔ اور اس لطف میں لوگ اس قدر محو اور مست و از خود رفتہ ہو رہے تھے کہ کسی کو انجام کی خبر ہی نہ تھی۔ عمارات شاہی اور رمنہ وغیرہ کے اندر جانے کی اہل لکھنؤ جملہ ملازمین بلکہ ساکنین مٹیا برج کو عام آزادی حاصل تھی۔ باغوں میں پھریئے تو اس سے زیادہ پُر فضا مقام کہیں نصیب نہ ہو سکتا۔ دریا کے کنارے کھڑے ہو جائیے۔ تو عجب لطف نظر آتا۔ کلکتے کو آنے جانے والے جہاز سامنے سے ہو کے گزرتے۔ جو فورٹ ولیم کی سلامی کے لئے یہیں سے اپنی جھنڈیاں اتارنا شروع کر دیتے۔ اور لوگ سمجھتے کہ بادشاہ کی سلامی لے رہے ہیں۔ محلات کی ڈیوڑھیوں اور محل سراؤں کے دروازوں پہ کھڑے ہو جائیے تو عجب لطف کی دھوم دھام میں کبھی کبھی ایسی صورتیں نظر آجاتیں اور ایسی فصیح و دلکش زبان اور ایسی مزے مزے کی پیاری باتیں سننے میں آجاتیں کہ انسان مدتوں بلکہ زندگی بھر مزہ لیا کرتا۔

آہ! یہ خوبصورت اور دلفریب نقش تو مٹنے کے قابل نہ تھا۔ مگر ہائے زمانے نے مٹا ہی دیا۔ اور ایسا مٹایا۔ کہ گویا تھا ہی نہیں۔ ۱۳۱۶ھ محمدی ۱۸۸۷ء میں یکایک بادشاہ کی آنکھ بند ہوئی۔ اور معلوم ہوا۔ کہ "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا"

سب باتیں خواب و خیال تھیں۔ ایک طلسم تھا۔ کہ یکایک ٹوٹ گیا اور وہ خوبصورت بقعہ جس کی زیارت کی تمنا یورپ کے سلاطین اور ہندوستان کے والیان ملک کو رہا کرتی تھی۔ آج ایک وحشتستان فنا اور عبرت کدہ ہے جہاں

کچھ بھی نہیں۔ جس نے اس اگلے رنگ کو کبھی دیکھا تھا۔ اب وہاں کے سناٹے کو دیکھ کے سوا اس کے کہ کمال حسرت واندوہ کے ساتھ ایک ٹھنڈی سانس بھرے ہے۔ "رہے نام اللہ کا" اور کیا کر سکتا ہے؟

اس دربار کے فرماں رواؤں کی تاریخ میں سے صرف اس قدر بتانا باقی ہے کہ مرزا برجیس قدر بہادر لکھنؤ سے بھاگے۔ تو سرحد نیپال پر جا کر دم لیا۔ ہمراہ رکاب تقریباً ایک لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا۔ ان لوگوں نے ارادہ کیا۔ کہ ہمالیہ کی گھاٹیوں میں پناہ گزین ہو جائیں۔ اور جب موقع ملے نکل کر انگریزوں پر حملہ کریں فتح ہو تو اپنے وطن پہنچیں۔ شکست ہو۔ تو پھر بھاگ کے پہاڑوں میں ہو رہیں۔ مگر یہ نبھنے والی صورت نہ تھی۔ ریاست نیپال نہ اتنے آدمیوں کو اپنے وہاں پناہ دے سکتی تھی اور نہ ان کے لئے انگریزوں سے لڑ سکتی تھی۔ اس میں اتنی قوت ہی نہ تھی کہ انگریزوں کا مقابلہ کرتی۔ لہٰذا حکومت نیپال نے صرف مرزا برجیس قدر اور ان کی ماں کو تو پناہ دے دی۔ مگر ان کے ہمراہی طوفان بے تمیزی کو قطعی حکم دے دیا۔ کہ فوراً واپس جائیں۔ اور نہ جائیں۔ تو مار کے نکال دیئے جائیں۔ نیپال کی قلمرو فوراً ان سے خالی کرالی جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب کے سب وہاں سے نکل نکل کے بھاگے۔ بہت سے مارے گئے۔ بہت سے بھیس بدل بدل کے کسی طرف نکل گئے اور مرزا برجیس قدر مع اپنی والدہ کے خاص نیپال میں جا کے سکونت پذیر ہو گئے۔ دربار نیپال سے ان کے لئے کچھ معمولی وظیفہ مقرر ہو گیا۔

اور کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ جس قدر جواہرات تھے سب دولت نیپال کی نذر ہو گئے آخر حضرت محل وہیں پیوند زمین ہوئیں اور ان کے بعد ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر دولت برطانیہ نے مرزا برجیس قدر کا قصور معاف کر دیا انہیں واپس آنے کی اجازت ملی تو بغیر کسی کو اطلاع دیئے نیپال سے بھاگ کے کلکتے پہنچے۔ یہاں واجد علی شاہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور بحیثیت اولاد اکبر مرزا قمر قدر سب سے زیادہ تنخواہ پا رہے تھے۔ برجیس قدر نے دعویٰ کیا۔ کہ بادشاہ کے تمام بیٹوں سے زیادہ معزز و مستحق میں ہوں۔ از روئے قانون پنشن بادشاہ کی پنشن میں سے ایک ثلث گھٹا کے باقی تنخواہ مجھ پر جاری کی جائے۔ اور ان کے تمام ورثا اور وابستگان دامن کی خبرگیری میرے ذمے کی جائے۔ اس کی پیروی میں وہ انگلستان میں جانے کی تیاریاں کر ہی رہے تھے۔ کہ ان کے خاندان والوں ہی میں سے کسی نے دعوت کی۔ دعوت سے واپس آئے۔ تو قے و دست جاری ہو گئے آناً فاناً حالت خراب ہو گئی۔ اور ایک ہی دن میں وہ۔ ان کی بی بی۔ اور ان کے کئی فرزند سب کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ اور دنیا اس خاندان کی ان تمام یادگاروں سے خالی ہو گئی جنہوں نے کبھی تخت و تاج کی صورت دیکھی تھی۔

تاہم مٹیا برج کی چہل پہل اور اس نئی بستی کی رونق و آبادی نے ایسی صورت پیدا کر لی تھی۔ کہ اگر چشم زخم حوادث سے بچ جاتا تو مدتوں تک یاد دلاتا رہتا کہ اس بخت برگشتہ بادشاہ کے دربار اور اس کے وابستگان دامن کی کیا وضع قطع تھی اور کیا مذاق تھا۔ مگر برٹش گورنمنٹ کی عدالت گستری نے واجد علی شاہ کا ترکہ تقسیم کرنے اور ان کے ورثا کی داد رسی میں یہ شان عدالت دکھائی کہ ساری جائیداد اور سارا گھر بار بیچ کے حصہ رسدی سب میں تقسیم کر دیا جائے۔ اور جو کچھ ہے نقد روپیہ کی صورت میں کر لیا جائے۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ کہ مٹیا برج کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ لاکھوں کا سامان کوڑیوں کو بک گیا۔ اور وہی بقعہ جو چند روز میں باغ ارم بن گیا تھا حقیقی ادبار کا جہنم ہو کے رہ گیا۔ اب تم وہاں جا کے خاک اُڑاؤ کچھ نہ نظر آئے گا۔ اگر آنکھیں اگلی رونق اور چہل پہل کو ڈھونڈتی ہوں۔ تو کسی امراؤ القیس کو بلاؤ۔ جو آنسو بہاتا جائے اور نہیں بتاتا جائے۔ کہ یہاں مرصع منزل تھی۔ یہاں نور منزل تھی۔ یہاں سلطان خانہ تھا۔ اور یہاں اسد منزل تھی۔ وہاں مشاعرے ہوتے تھے۔ وہاں علمائے باکمال کی مجلس تھی۔ وہاں یاران با صفا کی بذلہ سنجیاں تھیں۔ اور وہاں فصحائے جادو بیان کی سحر طرازیاں تھیں۔ اس مقام پر منتخب حسینانِ جہاں کا جھرمٹ تھا۔ اس مقام پر رقص و سرود کی محفل گرم تھی۔ اس مقام پر حور وش مہ جبینوں کو گانے ناچنے کی تعلیم ہوتی تھی اور اس مقام پر جہاں پناہ نازآفرین ممتوعات کے بیچ میں بیٹھ کے جشن منایا کرتے تھے۔ اس جگہ افیونیوں کے مجمع میں داستان ہوتی تھی۔ اس جگہ بٹیروں کی پالیاں ہوتی تھیں۔ اس جگہ کبوتر اڑاتے تھے۔ اور اس جگہ کنکوتے کے میدان بدے جاتے تھے۔ اس ڈیوڑھی پر ماہ وش جادو نگاہیں پردے سے سر نکالے جھانکتی نظر آتی تھیں اس ڈیوڑھی پر ما مار میلوں کی آمد و رفت سے ہر وقت ایک عجیب جوش و خروش نمایاں رہتا تھا۔ اس ڈیوڑھی پر خاص خاص شعرا حاضر رہتے۔ اس لئے کہ محل سرا والی کو فن شعر سے دلچسپی تھی۔ اور اس ڈیوڑھی پر روز رنگین عبارت لکھنے والے جوان مزاج ادیبوں کی تلاش رہتی تھی۔ اس لئے کہ دوسرے تیسرے یہاں سے ایک نئے رنگ کا "نو روز نامہ" جا کے بادشاہ کے ملاحظے میں پیش ہوتا۔

لیکن مٹیا برج کے مٹ جانے پر بھی اس مرحوم دربار کی ہزاروں یادگاریں باقی ہیں۔ خود شہر لکھنؤ اور اس کی سوسائٹی اس دربار دُربار کی یاد دلا رہی ہے اور اودھ کی سرزمین کا چپہ چپہ اس کی عظمت کی یادگار ہے۔ اس لئے کہ اس پر جا بجا سلطنت ماضیہ کے مارکے بنے ہوئے ہیں۔ اہل لکھنؤ کی ہر حرکت اور ادا اگلے ارکان دربار کی زندہ تاریخ ہے۔ اور ان کی چال دیکھ کے بے اختیار زبان سے نکل جاتا ہے۔

"اے گل بتو خُرسندم تو بوئے کسے داری"

لہٰذا ان دیرپا آثار سلف کی یاد تازہ کرنے کی غرض سے اب یہ بتانا ہے۔ کہ اس دربار کے قائم ہونے سے لکھنؤ میں جو سوسائٹی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ کیا تھی! کیسی تھی؟ اور اس نے کس کس عنوان سے ہندوستان کی معاشرت پر اثر ڈال رکھا تھا ہندوستان میں ان دنوں فارسی زبان کورٹ لینگوج (درباری زبان) تھی اور اہل ہندوستان کی بہترین معاشرت ایرانی تہذیب سے ماخوذ تھی۔ دولت صفویہ کے عہد میں ایرانیوں کا عام مذہب شیعہ اثنا عشری ہو گیا تھا اور ہندوستان کا حکمران خاندان مغلیہ چغتائیہ مذہب اہل سنت کا پیرو تھا۔ مگر معاشرت پر فارسیت کا سکہ جاری ہونے کا یہ اثر تھا کہ باوجود اختلاف مذہب کے جو بھی یہاں آتے۔ ادب کے ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے۔ اسی اخلاقی رجحان نے نور جہاں بیگم کو جہانگیر کے تاج و تخت کا مالک بنا دیا اسی کی بدولت دہلی کے اکثر معززین عہدہ دار آخر عہد میں شیعہ تھے۔ اور اسی کی وجہ سے امین الدین خان نیشاپوری یہاں پہنچتے ہی نواب برہان الملک بن کے وادی گنگا کے سارے وسیع علاقے کے مالک ہو گئے۔ برہان الملک کا اثر اور اقتدار جس قدر بڑھتا۔ اور ترقی کرتا گیا اسی قدر زیادہ وہ باکمالان دہلی کے مرجع و ماویٰ بنتے گئے۔

باوجود اس کے ان کی اور نواب صفدر جنگ کی زندگی چونکہ ایک نئی سلطنت کی داغ بیل ڈالنے میں صرف ہوئی۔ اس وجہ سے سوا بہادر سپہ گروں کی قدر دانی کے انہیں قومی تمدن اور معاشرتی امور کی طرف متوجہ ہونے کے بہت ہی کم مہلت ملی۔ کیونکہ

ان باتوں کو بمقابل فوج کشی و فتح مندی کے امن و امان کے پرعیش زمانے سے زیادہ تعلق ہوا کرتا ہے۔

لیکن جب شجاع الدولہ نے بکسر کی لڑائی میں ہمت ہارنے کے بعد انگریزوں سے نیا معاہدہ کیا اور مجبور ہو کے فیض آباد میں خاموش بیٹھے تو زمین اودھ میں ایک نئے تمدن کی بنیاد پڑ گئی۔

شجاع الدولہ کے زمانے میں کثرت سے باکمالان دہلی وطن چھوڑ چھوڑ کے یہاں آنے لگے تھے۔ دہلی سے فیض آباد تک ہر پیشے اور ہر طبقے کے لوگوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ اور صرف نو سال کی مدت میں فیض آباد کیا سے کیا ہو گیا شجاع الدولہ کے بعد نواب آصف الدولہ نے جب لکھنؤ میں قیام کیا۔ تو فیض آباد کا جما جمایا اکھاڑہ یک بارگی فیض آباد سے اکھڑ کے لکھنؤ میں آ گیا اور دہلی کے اہلِ خاندانوں اور باکمالوں کا جو سیلاب فیض آباد کو جا رہا تھا لکھنؤ ہی میں روک لیا گیا۔ جو کہ عین سر راہ واقع ہوا تھا۔ اور آخر میں چند شرفا و صاحب ہنر جو فیض آباد میں بیگموں کی سرکاروں میں الجھے رہ گئے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ بھی لکھنؤ میں آ گئے اس لئے کہ آصف الدولہ نے یہاں دولت کی ایسی گنگا نہیں بہا رکھی تھی۔ کہ کوئی سنتا اور سیراب ہونے کے شوق میں بے اختیار نہ دوڑ پڑتا۔

ان دنوں یوں تو بہت سی ہندو ریاستیں موجود تھیں۔ مگر مہذب اور شائستہ دربار مسلمان حکمرانوں ہی کے سمجھے جاتے تھے۔ اور ہندو راجہ خود معترف تھے۔ کہ تمدن اور معاشرت میں ہم مسلمان درباروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اپنی قدیم تہذیب کو زندہ کر کے اپنے لئے نیا تمدن اور نیا لٹریچر پیدا کرنے کا خیال جس ان میں انگریزی تعلیم نے نہیں پیدا کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اگر کوئی باکمال عالم شاعر یا سپاہی مسلمان امرا سے برداشتہ خاطر ہو کے ہندو امرا کے علاقے میں پہنچ جاتا۔ تو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا اور دیوتاؤں کی طرح اس کی قدر و منزلت کی جاتی۔ مسلمان دربار ان دنوں چند گنتی کے تھے۔ سب سے پہلے تو دہلی کا دربار مغلیہ تھا اور اس کی قدامت اور گذشتہ شوکت کی وجہ سے ہر قسم کے کمالوں اور مستند خاندانی شرفا کی کان دہلی ہی ہوئی تھی اور ایسی زمین کے منتشر روڑے تھے جنہوں نے دور دور دراز صوبوں میں جا کے نئے نئے دربار قائم کئے تھے جن میں دکن میں آصف جاہ کا دربار تھا۔ وہاں سے آگے بڑھ کے ٹیپو سلطان اور نواب ارکاٹ کے دربار تھے۔ شمال میں دہلی سے چلیئے تو پہلے روہیلکھنڈ کے بہادر خوانین کی قلمرو ملتی۔ اس کے بعد یہ اودھ کا دربار تھا۔ پھر اس سے آگے مرشد آباد میں نواب ناظم بنگالہ کا دربار تھا۔ مذکورہ اسلامی درباروں سے دکن کے دربار نہایت ہی دور تھے۔ ان کا راستہ اول تو جنگلوں اور پہاڑوں کی وجہ سے نہایت ہی دشوار گزار تھا اور اس پر بھی جرأت کر کے کوئی چل کھڑا ہوتا۔ تو ٹھگ اور ڈاکو جو سارے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ راستے ہی میں اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتے۔

ٹیپو سلطان اور نواب کرناٹک کی قلمرو تک جانا درکنار کسی کو نظام حیدر آباد کی مملکت تک پہنچنا بھی مشکل سے نصیب ہوتا۔ اس لئے جب دہلی بگڑنا شروع ہوئی اور تاجداران مغلیہ کی حالت خراب ہونے سے قدر دانی کا بازار وہاں سرد پڑا تو لوگوں نے عموماً شمالی ہندوستان کا رخ کیا۔ اس میں شک نہیں کہ روہیلکھنڈ بہت قریب تھا۔ یہاں کے خوانین اگر قدر دانی کرتے تو ان سے زیادہ موقعہ کسی کو نہیں حاصل تھا۔ مگر ان میں دین داری تھی۔ شجاعت تھی اور بہت سی خوبیاں تھیں۔ مگر علمی مذاق اور معاشرتی رنگینیوں سے وہ لوگ بالکل مبرا تھے۔ ان کی حالت کا صحیح اندازہ کیجئے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ خالص فوجی مذاق کے لوگ تھے جنہیں اپنے ہم وطنوں کے جمع کرنے اور اپنے جرگوں کی تعداد بڑھا کے اپنی قوت کو ترقی دینے کے سوا اور کسی بات کا شوق نہ تھا۔ معاشرت کے رسیلے پن اور تمدنی زندگی کے آداب و اخلاق کے لحاظ سے دیکھیئے تو ان کی حالت بالکل وحشی گنواروں کی سی تھی۔ ایسے لوگ بھلا شاعروں ادیبوں اور دیگر قسم کے باکمالوں کی کیا قدر کر سکتے تھے؟ لہٰذا ان کی سرزمین میں جو داخل ہوا۔ قدم بڑھاتا ہوا آگے نکل گیا۔ چار پانچ منزلیں طے کر کے لکھنؤ پہنچا۔ تو دیکھا۔ کہ رئیس سے لے کر ادنیٰ طبقے والے تک استقبال میں آنکھیں بچھا رہے ہیں اور ہر طرح خدمت گزاری کو تیار ہیں۔ ایسی جگہ پہنچ کے پھر بھلا کون واپس آ سکتا ہے؟ جو گیا یہیں کا ہو گیا۔ اور دہلی کا ہر خانماں برباد یہاں آتے ہی پاؤں توڑ کے بیٹھ گیا۔ نہ وطن ہی یاد رہا اور نہ کسی اور دربار کے دیکھنے کی ہوس ہی دل میں باقی رہی۔ چند لوگ یہاں سے آگے بڑھ کے نواب ناظم بنگالہ تک بھی پہنچ گئے۔ مگر وہ وہی تھے جن کی لکھنؤ قدر نہ کر سکا۔ مگر ایسے چند گنتی ہی کے لوگ تھے۔ ورنہ دہلی سے جتنے باکمال آئے سب لکھنؤ ہی میں کھپتے چلے گئے۔ تھوڑے ہی زمانے کے اندر یہ حالت ہو گئی کہ اس دور کی مہذب ترین سوسائٹی کے جتنے مشہور اور نامور بزرگ تھے۔ سب لکھنؤ کے اندر جمع تھے۔ فقط ایک چیز لکھنؤ میں اس دربار کے قائم ہونے سے پہلے موجود تھی اور وہ عربی کا علم و فضل تھا۔ جس کی بنیاد اس وقت پڑ گئی تھی۔ جب شہنشاہ اورنگ زیب نے فرنگی محل کے مکانات ملا نظام الدین سہالوی کو عطا کئے تھے۔ ملا صاحب ممدوح اور ان کے خاندان کے قیام نے چند ہی روز میں فرنگی محل کو ہندوستان کی ایک ایسی اعلیٰ ترین یونیورسٹی بنا دیا کہ سارے ہندوستان کے علما و فضلا کا مرکز لکھنؤ کا یہی چھوٹا سا محلہ قرار پا گیا۔

شیخ عبدالحق دہلوی کے بعد دہلی میں بھی کوئی نمود کا عالم نہیں پیدا ہو سکا تھا۔ آخر میں شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان نے البتہ بہت بڑا عروج حاصل کیا۔ مگر ان کی شہرت علم حدیث تک محدود تھی مگر حدیث کے علاوہ اور جتنے علوم ہیں۔ ان سب کی یونیورسٹی لکھنؤ ہی تھا۔ ان دنوں لکھنؤ ایک گمنام شہر تھا۔ مگر ایسے ایک گمنام مقام کا اتنی بڑی یونیورسٹی بن جانا کہ ہندوستان و کلہ بخارا۔ خوارزم اور ہرات و کابل اس کے آگے سر جھکا دیں۔ بہت ہی حیرت کے قابل ہے۔ ساری اسلامی دنیا یہیں کی شاگردی پر فخر کر رہی تھی اور یہیں کے منتخب کئے ہوئے نصاب تعلیم یعنی سلسلۂ نظامیہ کی پیرو تھی۔ غرض علمائے فرنگی محل کی بدولت اس نئے دربار کے قائم ہونے سے ہی پہلے لکھنؤ حکمت و فلسفہ منطق و کلام۔ فقہ و اصول فقہ اور دیگر مختلف علوم کا معدن و مرجع بن چکا تھا لہٰذا ایک اس چیز میں تو لکھنؤ اس نئے دربار کا زیر بار احسان نہیں ہے۔ باقی اور تمام ترقیاں اس سلطنت کے قائم ہونے ہی سے پیدا ہوئیں۔

دہلی سے لکھنؤ میں جو چیزیں آئیں

سب سے مقدم اردو زبان ہے جو دہلی کے ان شرفا اور سرداران فوج کی زبان تھی۔ جو اب برہان الملک بہادر کے ساتھ لکھنؤ میں آئے تھے۔ یہ زبان دہلی میں پیدا ہوئی اور اس کی شاعری کا آغاز دکن سے ہوا۔ ولی گجراتی نے دہلی میں آ کے اپنا دیوان پیش کیا۔ اور اپنے نغمۂ دلکش سے اہل زبان کو خواب غفلت سے

جگایا۔ اس نغمے میں کچھ ایسا جادو تھا کہ سنتے ہی سب کی زبان پر یہی نغمہ جاری ہو گیا اور دہلی میں اردو شاعری شروع ہو گئی۔

ابتداً چند ہی بزرگ تھے۔ جنہوں نے استادی کی شان سے دہلی میں داد سخن دینا شروع کی۔ مگر اس زمانے کو اگر اردو زبان کی طفلی نہیں تو اردو شاعری کا بچپن کہنا چاہیئے۔

دنیائے اردو کے ان سابقین الاولین میں سب سے زیادہ صاحب علم و فضل اور سب سے بڑے باکمال خان آرزو تھے جنہیں مولانا آزاد مرحوم نے دوسرے دور شاعری میں رکھا ہے۔ زمانۂ مابعد کے بڑے بڑے باکمال جن میں سودا۔ میر میرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد شامل ہیں۔ سب ان کے شاگرد تھے۔ شاعری اور کمال زباندانی کے لکھنؤ میں آنے کی بنیاد انہیں استاد اول خان آرزو سے پڑی۔ نواب شجاع الدولہ کے ماموں سالار جنگ نے کمال قدردانی سے انہیں لکھنؤ بلوایا اور ایک زمانے تک اودھ میں اقامت گزین رہ کے وہ شجاع الدولہ کی مسند نشینی کے دو برس بعد ۱۱۶۹ھ ۱۱۸۴ محمدی مطابق ۱۷۵۵ء میں خاص لکھنؤ کے اندر رہگرائے آخرت ہوئے۔ وہی پہلے استاد اردو شاعری کے تھے اور انہیں سے اردو شعر و سخن کے لکھنؤ میں آنے کی بنیاد پڑی۔ مگر افسوس کہ ان کی ہڈیاں سرزمین لکھنؤ کے دامن شوق سے چھین کے خاک دہلی کو سونپ گئیں۔

اس کے بعد اسی دور کے دوسرے نامی استاد سخن اشرف علی خاں فغاں نے جو احمد شاہ بادشاہ کے کوکا تھے قدردانی کی تلاش میں لکھنؤ کی راہ لی۔

شجاع الدولہ نے نہایت ہی تعظیم و تکریم کی۔ ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور ایک زمانے تک اپنے دربار میں رکھا۔ مگر شعرا نازک خیالی سے زیادہ نازک دماغ ہوا کرتے ہیں۔ کسی خفیف سی بات پر روٹھ کے عظیم آباد چلے گئے اور شجاع الدولہ کی وفات سے دو برس پہلے وہیں پیوند زمین ہو گئے۔

اب مولانا آزاد کا مقرر کیا ہوا تیسرا دور شاعری شروع ہوا۔

شاعری کا تیسرا دور

خان آرزو کے شاگرد نظم اردو پر حکومت کر رہے تھے اس زمانے کی حالت دیکھنے سے نظر آتا ہے کہ دہلی اپنے باکمالوں کو اپنے آغوش میں سنبھال نہیں سکتی۔ ہر طرح کے صاحبانِ کمال اس کی سواد سے نکلتے چلے جاتے ہیں۔ اور جو جاتا ہے۔ پھر نہیں آتا۔ اس کے مقابل لکھنؤ کی یہ حالت ہے کہ جو صاحب فن آتا ہے چاہے کہیں کا ہو۔ یہیں کا ہو جاتا ہے مرزا رفیع سودا۔ میر تقی میر۔ سید محمد میر سوز جو اس تیسرے دور کے پیغمبران سخن ہیں۔ سب دہلی چھوڑ چھوڑ کے لکھنؤ میں آئے اور یہیں پیوند زمین ہو گئے۔ ان کے علاوہ جو باکمالان سخن اس زمانے میں وارد لکھنؤ ہوئے اور یہیں کے ہو گئے میرزا جعفر علی حسرت۔ میر حیدر علی حیران۔ خواجہ حسن حسن۔ مرزا فاخر مکین میر ضاحک۔ بقاء اللہ خان بقا۔ میر حسن دہلوی۔ میر ضاحک کے فرزند۔ مصحفیؔ اور انہیں کے۔ ایسے بیسیوں شعرا ہیں۔ میر قمر الدین منت۔ میر ضیاء الدین ضیا۔ اشرف علی خان فغان دہلی سے لکھنؤ میں آ کے ایک مدت تک رہے۔ اور یہیں چمکے۔ مگر آخر میں بیرونی قدردانوں کی کشش سے کلکتے اور عظیم آباد میں جا کے نذر اجل ہوئے۔ شیخ محمد قائم قائم کا انتقال اگرچہ ان کے وطن نگینے میں ہوا۔ مگر وہ بھی ایک مدت تک اسی لکھنؤ کی سبھا کے ایک ایکٹر تھے۔ صرف مرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد کے ایسے چند بزرگ دہلی میں پڑے رہ گئے۔ جن کو فقیرانہ قناعت اور مرجعیت کی وجہ سے دہلی میں قدم جمانے کا موقع مل گیا تھا۔ و سجادہ نشینی کی وجہ سے اپنی مسند درویشی کو نہ چھوڑ سکتے تھے۔ غرض شاعری کا یہ تیسرا دور وہ زمانہ ہے۔ جبکہ دہلی کی سبھا وہاں سے اکھڑ کے لکھنؤ میں جم رہی تھی اور لکھنؤ میں ایک جوش قدردانی تھا۔ جس سے ہندوستان کی تاریخ خالی ہے۔

چوتھا دور

اب چوتھا دور شروع ہوا۔ اس کے ارکان بھی اگرچہ دہلی و اکبرآباد وغیرہ کی خاک سے پیدا ہوئے تھے۔ مگر سب کی شاعری لکھنؤ ہی میں چمکی۔ یہیں سے ان کا نام مشہور ہوا۔ یہیں کے مشاعروں کے میر مجلس تھے یہ لوگ علی العموم یہیں سے نکلے۔ یہیں رہے۔ یہیں عروج پایا اور یہیں مرکھپ گئے اس دور کے رکن رکین جرأت۔ سید انشا۔ مصحفی۔ قتیل اور رنگین وغیرہ تھے۔ یہ لوگ اپنے عہد میں زبان پر حکومت کر رہے تھے اور ان کی شاعری کا غلغلہ اس قدر بلند تھا۔ کہ ان کے سامنے کسی اردو شاعر کا نام چمک ہی نہ سکا۔ ان سب کی ہڈیاں کہاں ہیں؟ لکھنؤ کی خاک میں۔

اس زمانے میں دہلی کے صاحبان مذاق جس کثرت سے لکھنؤ میں آ رہے تھے اس کا اندازہ [illegible] کی ایک روایت سے ہو سکتا ہے جس میں انہوں نے اس عہد کے ایک شریف بوڑھے اور نوراً نام ایک طوائف کی گفتگو نقل کی ہے۔ وہ بزرگ اور کسبی دونوں دہلی کے ہیں مگر دونوں لکھنؤ میں باتیں کر رہے ہیں۔ بی نوراً کہتی ہیں ——

"اجی آؤ میر صاحب! تم تو عید کا چاند ہو گئے۔ دلی میں آتے تھے دو دو پہر رات تک بیٹھتے تھے۔ لکھنؤ [illegible] نہیں کیا ہو گیا کہ کبھی صورت بھی نہیں دکھاتے۔ اب کی کربلا میں کتنا میں نے ڈھونڈا۔ کہیں تمہارا اثر آثار معلوم نہ ہوا۔ ایسا نہ کیجیو کہ آٹھوں میں بھی نہ چلو۔"

اس کا جواب اگرچہ نہایت ہی دلچسپ ہے مگر ہم طوالت سے بچنے کے لئے اسے چھوڑے دیتے ہیں۔ انہوں نے دہلی اور لکھنؤ کے موجودہ رنگ پر اعتراضات کئے ہیں اور معاصر شعرا پر نکتہ چینی کی ہے۔ ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ اس زمانے میں شرفا تو درکنار۔ رنڈیاں تک لکھنؤ میں آ آ کے بستی جاتی تھیں اور جو لوگ دہلی میں پھول والوں کی سیر کے رسیا تھے اب کربلا اور آٹھوں کے میلے میں اپنا دل بہلاتے۔

شاعری کا پانچواں دور کونسا؟

مولانا محمد حسین آزاد نے بعد کے تمام شعرائے دہلی و لکھنؤ کو بلا لحاظ امتیاز و عہد ایک جگہ جمع کر کے اور زمانے کی طنابیں کھینچ کے پانچواں دور بنا دیا ہے۔ لیکن یہ ناانصافی ہے اصلی پانچواں دور صرف ناسخ و آتش کا تھا جس میں زبان نے نئی وضع اختیار کی بہت سے پرانے محاورے ترک ہو گئے۔ نئی بندشیں پیدا ہوئیں۔ اور اس زبان کی بنیاد پڑی جو بعد کے شعرائے دہلی و لکھنؤ میں یکساں طور پر مقبول ہوئی۔ اور قریب قریب وہ زبان بن گئی جو اب ہندوستان میں مستند ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جب شاعری کی قلمرو میں پہلے پہل لکھنؤ کا سکہ جاری ہوا۔

شاعری کا چھٹا دور

اس کے بعد چھٹا دور وہ تھا جب لکھنؤ میں وزیر۔ صبا رند۔ گویا۔ اشک۔ نسیم دہلوی۔ اسیر۔ نواب مرزا شوق۔ در پنڈت دیا شنکر نسیم صاحبان مثنوی کی شاعری کا شہرہ تھا اور دہلی میں مومن۔ ذوق غالب نغمہ شاعرانہ سنا رہے تھے۔ اس دور نے سچ یہ ہے کہ زبان کو بہ لحاظ خیالات سب سے زیادہ ترقی کے مقام تک پہنچایا۔

شاعری کا ساتواں دور

اس کے بعد ساتواں دور امیر۔ داغ۔ منیر۔ تسلیم۔ عروج۔ جلال۔ سلطانت۔ افضل اور حکیم وغیرہ کا تھا۔ ان آخری دوروں پر گہری نظر ڈالنے سے صاف نظر آجاتا ہے کہ فصاحت زبان اور شاعری نے لکھنؤ میں کیسی جڑ پکڑلی تھی۔ چند ہی روز میں شعر کہنا لکھنؤ میں ایک وضع داری بن گیا اور شعرا کی یہاں اس قدر کثرت ہوگئی کہ شاید کہیں کسی زبان میں ہوئی ہوگی۔ عورتوں تک میں شعر و سخن کا چرچا ہوا اور جہلا کے کلام میں بھی شاعرانہ خیال آفرینیوں تشبیہوں اور استعاروں کی جھلک نظر آنے لگی۔

لکھنؤ میں مثنوی اور فارسی اثرات کا آغاز

فارسی شاعری کا آغاز درحقیقت مثنوی سے ہوا ہے اور یہ صنف شاعری ہمیشہ سب سے زیادہ اہم اور باوقعت سمجھی گئی۔ ابتدا فردوسی کی رزمیہ مثنوی شاہنامے سے ہوئی۔ پھر نظامی۔ سعدی۔ مولانا روم۔ خسرو۔ جامی۔ اور ہاتفی وغیرہ نے اس میں اعلیٰ ترین شہرت و ناموری حاصل کی۔ اردو میں میر تقی میر نے چھوٹی چھوٹی بہت سی مثنویاں دہلی اور لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں لکھی تھیں مگر وہ اس قدر مختصر اور معمولی ہیں کہ مثنویوں کے تذکرے میں ان کا ذکر بھی بے محل سا معلوم ہوتا ہے۔

مثنوی لکھنے کا آغاز اردو میں میر ضاحک کے بیٹے میر غلام حسن حسن سے ہوا۔ جو بچپن ہی میں اپنے والد بزرگوار کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے تھے۔ یہیں کی صحبت میں ان کی نشو و نما ہوئی۔ یہیں پرورش پائی تھی اور اسی جگہ کی آب و ہوا میں ان کی شاعری پلی تھی۔ کیونکہ جس تعلیم اور جس سوسائٹی نے ان کی مثنوی "بے نظیر و بدر منیر" لکھوائی وہ خاص لکھنؤ کی تھی۔ اسی زمانے میں مرزا محمد تقی خان ہوس نے مثنوی لیلیٰ مجنوں لکھی۔ اور لکھنؤ میں مثنویت کا ذوق بڑھنا شروع ہوا۔ آتش اور ناسخ کے زمانے میں تو ذرا خاموشی رہی۔ مگر پھر جو یہ مذاق ابھرا تو پنڈت دیاشنکر نسیم نے گلزار نسیم۔ آفتاب الدولہ قلق نے طلسم الفت اور نواب مرزا شوق نے بہار عشق زہر عشق اور فریب عشق لکھیں۔ اور انہیں اس قدر عام شہرت اور عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی کہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی زبان پر ان مثنویوں کے اشعار چڑھ گئے۔ اس سے پیشتر کے زمانے میں کسی صاحب نے مثنوی میر حسن کے جواب میں لذت عشق نام ایک مثنوی لکھی تھی وہ نواب مرزا شوق کی مثنویوں کے ساتھ شائع ہونے کی وجہ سے ان ہی کی جانب منسوب کی گئی۔ لیکن حقیقت میں نہ وہ ان کی ہے اور نہ ان کے زمانے کی ہے۔

ان سب مثنویوں کے دیکھتے مثنوی گلزار نسیم باوجود عام مقبولیت کے صدہا غلطیوں سے بھری ہے۔ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نازک خیال نومشق ہے جو ہر قسم کی شاعرانہ خوبیاں اپنے کلام میں پیدا کرنا چاہتا ہے مگر قادر الکلامی کے نہ ہونے سے قدم قدم پر ٹھوکر کھا رہا ہے اور کسی جگہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اس کے جواب میں آغا شمس علی نے جو ایک بہت ہی کہنہ مشق شاعر تھے اسی بحر میں ایک مثنوی لکھی تھی جس میں غلطیوں سے پاک رہ کر تشبیہات۔ استعارات اور رعایت لفظی کے کمالات دکھائے ہیں۔ مگر افسوس وہ مثنوی مٹ گئی اور گلزار نسیم کو جو شہرت حاصل ہو چکی تھی اس پر غالب نہ آسکی۔ دہلی میں ان دنوں مومن خان مومن نے چند چھوٹی چھوٹی بے مثل مثنویاں لکھیں جو بہت مقبول اور مشہور رہیں۔ مومن خان کے مذاق شاعری میں نازک خیالی بڑھی ہوئی تھی۔ خیالی تشبیہوں اور استعاروں پر وہ اپنی سخن آفرینی کی عمارت قائم کرتے تھے۔ مثنویوں میں وہ زیادہ تر خیالی جذبات و صفات کو زندہ کرکے پیش کرتے تھے۔ مومن خان مومن کے ایک شاگرد نسیم دہلوی لکھنؤ آئے۔ اور یہاں کے مشاعروں میں اپنا رنگ ایسا جمایا کہ بہت سے لوگ ان کے شاگرد ہو گئے۔ نسیم دہلوی نے اردو مثنویوں میں نظیری۔ عرفی و صائب کی خیال آرائیاں دکھا دیں اور نظم اردو میں جیتے جاگتے نفیسی و فغیت لا کے کھڑے کر دیئے۔

آخر زمانے میں مولوی میر علی حید رطبا طبائی نظم لکھنوی نے شراب کی مذمت میں ساقی نامہ شگفتیہ کے نام سے ایک ایسی بے نظیر اخلاقی نظم اردو میں عوام کے سامنے پیش کی کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ غرض کہ مومن کی چند مختصر مثنویوں سے اگر قطع نظر کر لی جاتے تو اردو مثنوی گوئی کا آغاز بھی لکھنؤ میں ہوا اور ترقی بھی یہیں ہوئی۔ بعض حضرات میر حسن اور گلزار نسیم کے ذریعے سے دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا مقابلہ و موازنہ کیا کرتے ہیں۔ جس خیال کو مولوی محمد حسین آزاد نے اور زیادہ قوت دے دی۔ لیکن اول تو گلزار نسیم کو نظیر اکبر آبادی کے بنجارے نامے کی طرح اگر شہرت ہو بھی گئی تو اسے مثنوی میر حسن کے مقابلے میں رکھنا اردو شاعری کی سخت تذلیل و توہین ہے۔ صحیح مقابلہ ہو سکتا ہے تو میر حسن کی مثنوی اور مثنوی طلسم الفت کا۔ اور اگر گلزار نسیم کی زبان زبردستی لکھنؤ کی زبان مان لی جائے تو مثنوی میر حسن اور گلزار نسیم کا مقابلہ دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا نہیں بلکہ خود لکھنؤ کی اگلی پچھلی زبانوں کا مقابلہ ہوگا۔ اس لیئے کہ مثنوی میر حسن لکھنؤ کی پہلی زبان کا نمونہ ہے اور یہ آخری زبان کا۔

لکھنؤ میں مرثیہ خوانی

قدیم عربی شاعری میں زیادہ تر مرثیے اور رجز ہی ہمارے شعر و سخن میں اظہار کمال کا ذریعہ تھے۔ فارسی میں مرثیہ خوانی کمزور پڑ گئی تھی لیکن بہ عہد سلاطین صفویہ ایران میں مذہب شیعہ کو فروغ حاصل ہوا تو مصائب اہل بیت رسالت کی یاد تازہ کرنے کے لئے شعرا کو مرثیہ خوانی کی طرف توجہ ہوئی۔ مولانا محتشم کاشی نے چند بندوں کا ایک بے مثل مرثیہ لکھا تھا جو عموماً مقبول ہوا۔ اس کے بعد سے رواج تھا کہ شعرا کبھی کبھی ماتم حسین ؑ میں دو ایک مرثیے موزوں کر دیا کرتے۔ لیکن شعر و سخن کی دنیا میں مرثیہ گوئی کی وقعت اس قدر کم تھی کہ مشہور تھا "بگڑا شاعر مرثیہ گو"۔ پھر مذہبی اعتبار سے دولت صفویہ مرحومہ کی جانشین اودھ کی سلطنت قرار پائی تو لکھنؤ میں مجالس کی ترقی و عزاداری کے جوش و خروش نے مرثیہ گوئی کی ایسی قدر دانی کی کہ اس فن کو غیر معمولی عروج حاصل ہونا شروع ہوا اور در اصل لکھنؤ کے عروج کا سارا راز اسی تاریخی واقعے میں پوشیدہ ہے۔ ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت تھی جنہوں نے فارسی زبان کو درباری زبان قرار دیا۔ اور فارسی معاشرت ان کی امیرانہ زندگی اور ان کے تمام کمالات کا مرکز تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ایرانی ہندوستان میں آتے ہی آنکھوں پر بٹھایا جاتا اور اس کی ہر حرکت اور ہر وضع مقبولیت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی۔ دہلی کی سلطنت میں بادشاہوں کا مذہب سنی ہونے کی وجہ سے ایرانی اپنی بہت سی باتوں کو چھپاتے اور وہاں کی محفلوں میں اس قدر شگفتہ نہ ہونے پاتے جس قدر کہ وہ اصل میں تھے۔

اودھ کا دربار شیعہ تھا۔ اور یہاں کا خاندان حکمرانی خاص خراسان سے آیا تھا اس لیئے یہاں ایرانی بالکل کھل گئے۔ اور اپنے اصلی رنگ میں نمایاں ہونے کی وجہ سے وہ جس قدر شگفتہ ہوئے اسی قدر زیادہ ہم مذہبی کے باعث یہاں کے اہل دربار نے ان کی وضع قطع کو بھی حاصل کرنا اور اس کی نقل کرنا شروع کر دیا اور

ایرانیت جو دراصل ساسانی اور عباسی شان و شوکت کے آغوش میں پلی ہوئی تھی چند ہی روز کے اندر لکھنؤ کی معاشرت میں سرایت کر گئی۔

سودا اور میر کا زمانہ

لکھنؤ میں سودا اور میر کے زمانے میں سکندر، گدا، مسکین اور افسردہ مرثیہ گو شاعر تھے جو چھوٹی چھوٹی نظمیں شہادت امام حسینؑ کے بیان میں تصنیف کر کے مجلسوں میں سنا دیا کرتے۔ ان کے بعد میر خلیق اور میر ضمیر نے مرثیہ گوئی کو بہت ترقی دی اور مرثیوں کی موجودہ وضع انہیں کے زمانے میں ایجاد ہوئی۔ یہاں تک کہ زمانہ میر ضمیر کے شاگرد مرزا دبیر اور میر خلیق کے بیٹے میر انیس کو ناموری کے شہ نشین پر لایا اور ان دونوں بزرگوں نے مرثیہ خوانی میں ایسے ایسے کمالات شاعری دکھائے کہ شعر و سخن کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کے چمکے۔ وہی مقابلہ جو میر و سودا اور آتش و ناسخ میں رہا تھا اب میر انیس اور مرزا دبیر میں قائم ہوا۔ مرزا دبیر میں شوکت الفاظ تھی۔ بلند خیالی تھی اور علم و فضل کا زور تھا۔ میر انیس میں سادگی بے تکلفی اور جذبات انسانی پر حکومت کرنے والی زبان کی وہ خوبیاں تھیں جو سوائے خدا کی عنایت کے سیکھنے سے نہیں آسکتیں۔ ان دونوں بزرگوں نے فن مرثیہ گوئی کو شاعری کی اور تمام اصناف سے بڑھا دیا اور اردو ادب میں وہ نئی چیزیں پیدا کر دیں کہ جن کو انگریزی تعلیم نے خالی کر دیا تھا۔

انیس و دبیر نے مرثیہ گوئی کو اس کمال درجہ پر پہنچا دیا کہ اب مرثیہ گوئی سب سے بڑا شاعرانہ ہنر بن گئی تھی۔ تمام اہل لکھنؤ ان دونوں بزرگوں کے اس قدر معترف و مداح ہوئے کہ سارا شہر دو گروہوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر سخن سنج یا انیسیہ تھا یا دبیریہ۔ اور ان دونوں گروہوں میں ہمیشہ باہمی مخالفت رہتی۔

میر انیس نے مرثیہ گوئی کے ساتھ مرثیہ خوانی کو بھی ایک فن بنا دیا۔ یونانیوں کے بعض مقرروں اور خطیبوں کی نسبت سنا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی تقریروں میں اثر پیدا کرنے کے لئے خاص خاص کوششیں کی تھیں اور آواز کے نشیب و فراز اور تغیرات سے گفتگو میں اثر پیدا کرتے تھے۔ اسلام کی اس لمبی عمر میں اس نہایت ضروری فن کو بطور اصول خاص میر انیس نے زندہ کیا۔ الفاظ کے مناسب آواز کے تغیرات اور مضامین کے موافق چہرہ بنا لیتے۔ کلام کو اعضاء و جوارح کے متناسب حرکات اور خد و خال کے اشارات سے قوت دینے کا فن خاص لکھنؤ کی اور وہ بھی میر انیس کے گھرانے کی ایجاد ہے۔ جس کی ترقی میں اب تک کوششیں جاری ہیں۔

لکھنوی معاشرت میں ڈراما

ڈراما کا فن سخن جو مغربی شاعری کی جان ہے اس سے عربی۔ فارسی کا ادب مطلقاً خالی تھا اور فارسی کی شاگردی کی وجہ سے اردو میں بھی اس کی طرف کبھی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ سنسکرت میں اعلیٰ درجے کے ڈرامے تھے۔ مگر ان سے ہندوستان کی آخری سوسائٹی بالکل ناآشنا ہو چکی تھی۔ رام چندر جی اور سری کرشن جی کے کارنامے البتہ ہندوؤں میں مذہبی آداب کے ساتھ دکھائے جاتے تھے۔ مگر اردو شاعری کو ان سے کسی قسم کا تعلق نہ تھا۔

رام چندر جی کے حالات انگلستان کے اولمپیا کی طرح کھلے میدانوں میں رزمیہ نقالیوں کی شان سے دکھائے جاتے۔ اور سری کرشن جی کے حالات رقص و سرود اور موسیقی کے پیرائے میں مذہبی سٹیجوں پر اوپیرا کے طریقے سے نظر آتے جو رہس کہلاتے۔ واجد علی شاہ نے اپنا ایک ڈراما تیار کیا جس میں وہ کنہیا جی بنتے یا عشق کے ستائے ہوئے جوگی بن کے دھونی رماتے اور بہت سی عورتیں پریاں اور عاشق مزاج گوپیاں بن کے انہیں ڈھونڈتی پھرتیں۔ جب قیصر باغ کے میلوں کا دروازہ عامتہ الناس کے لئے بھی کھل گیا تو سارے شہر کے شوقینوں میں ڈراما کا فن خود بخود ترقی کرنے لگا اور چند ہی روز میں اس شوق کو اس قدر ترقی ہوئی کہ بعض مشہور شعرا بھی اس زمانے کے مذاق کے مطابق طبع آزمائیاں کرنے لگے اور ڈراما لکھنے لگے۔

اندر سبھا

چنانچہ واجد علی شاہ کے شوق کے ساتھ ہی میاں امانت نے جو ایک مشاق شاعر تھے اندر سبھا لکھی اور موجودہ عہد کی کمپنیوں کی طرح شہر میں جا بہ جا مختلف جماعتیں ان کی اندر سبھا کو اسٹیج پر کھیلنے لگیں جن میں کہیں عورتیں اور کہیں لڑکے پارٹ ادا کرتے۔ اس اندر سبھا میں اصول موسیقی کے مطابق دھنیں قائم کی گئیں اور سارا شہر اندر سبھا کے جلسے دیکھنے کا مشتاق تھا۔ امانت کی اندر سبھا کی کامیابی دیکھ کر اور لوگوں کو بھی شوق ہوا اور اس قسم کے بہت سے ڈرامے ایجاد ہوئے اور سب کا نام "سبھا" قرار پایا۔ چنانچہ شہر میں مداری لال وغیرہ کی بہت سبھائیں قائم ہو گئیں۔ جن کے پلاٹ بدلے ہوئے تھے۔

سبھا کے نئے رنگ نے شہر میں ایسی زندہ دلی پیدا کر دی کہ سوائے اندر سبھا کے لوگ کسی اور قسم کا ناچ گانا پسند ہی نہ کرتے تھے۔ ہر طرف سبھاؤں کی دھوم تھی اور اس کی بنیاد پڑ گئی کہ سوسائٹی کے مذاق کے مطابق اگلے عاشقانہ قصے نقل کے طور پر اچھی نظموں میں دلکش مضمون کے ساتھ پبلک کے سامنے پیش کیے جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ پارسی تھیٹروں نے اپنی انتظامی خوبیوں اور نمائشی دلفریبیوں کی وجہ سے سبھاؤں کا رنگ پھیکا کر دیا۔ لیکن یہ نہ سمجھو کہ ڈراما کا وہ پرانا مذاق جو لکھنؤ میں ایجاد ہو کے رواج پا یا ختم ہو گیا۔ اول تو پارسیوں نے بھی اس چیز کو لکھنؤ سے لیا۔ ان کا پہلا عام کھیل امانت کی اندر سبھا ہی تھا اور باوجود اس کے لکھنؤ کے تمام قومی جلسوں میں آج تک سپیر سے ہریش چندر وغیرہ کے ایسے بیسیوں ناٹک کرتے ہیں اور اس مذاق کے اداکاروں کا ایک مستقل گروہ ہے بہر حال اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ اردو ڈراما کی بنیاد لکھنؤ ہی میں پڑی اور یہیں سے اس کا سارے ہندوستان میں رواج ہوا۔

لکھنؤ کی واسوخت

اردو شاعری کی ایک قسم واسوخت ہے۔ یہ خاص قسم کے عاشقانہ مسدس ہوتے ہیں اور ان کا مضمون عموماً ہوتا ہے کہ پہلے اپنے عشق کا اظہار، اس کے بعد معشوق کا سراپا، اس کی بے وفائیاں پھر اس سے روٹھ کے یہ باور کرانا کہ ہم کسی اور معشوق پر عاشق ہو گئے۔ اس فرضی معشوق کے حسن و جمال کی تعریف کر کے حقیقی کو جلانا چھیڑنا۔ جلی کٹی سنانا۔ اور یوں اس کا غرور توڑ کے پھر ملاپ کر لینا۔ نظم اردو کی یہ قسم لکھنؤ ہی سے شروع ہوئی۔ زمانہ وسط کے قریب قریب تمام شاعروں نے واسوخت لکھے ہیں اور ان میں بڑے بڑے کمال پیدا کئے ہیں۔ دہلی میں بعد کے زمانے میں مختلف واسوخت لکھے گئے۔ خصوصاً مومن خان مومن نے کئی بہت اچھے واسوخت لکھے مگر اس کا آغاز بھی لکھنؤ سے ہوا۔

لکھنؤ کی ریختی اور ہزل

اُمرا کی عیاشانہ طبیعتوں نے شاعری کی کئی اور صنفوں کو بھی پیدا کرایا جن کا آغاز دہلی ہی سے ہوا تھا

ان میں سب سے زیادہ مہمل ہزل گوئی ہے اور کسی قدر پُرلطف ریختی ہے۔ ہزل گوئی کا آغاز دہلی میں جعفر زٹلی سے ہوا جو محمد شاہ کے زمانے میں تھے۔ ان کے کلام کو اول سے آخر تک پڑھیں، سوائے فحش گوئی اور حد سے گزری ہوئی بے حیائی کے نہ کوئی شاعرانہ خوبی نظر آئے گی اور نہ زبان کا کوئی لطف۔ اس کے بعد دہلی ہی کی خاک سے صاحبقران تخلص بگلام کے ایک ہزل گو لکھنؤ میں آئے اور یہیں چمکے۔ ان کا نام سید امام علی تھا اور آصف الدولہ کے زمانے میں وارد لکھنؤ ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے مبتذل مذاق والے رئیس زادوں میں ان کی نشو و نما ہوئی۔ ان کا دیوان ملتا ہے اور گو کہ کلام فحش اور تہذیب سے کوسوں دور ہے مگر پھر بھی اس میں ایک بات ہے۔ شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ زبان اور محاورں کا پورا لطف ہے۔ لیکن اس فن کو لکھنؤ کے آخری دور میں میاں مشیرؔ نے جو مرزا دبیر کے شاگرد تھے کمال کے درجے کو پہنچا دیا۔ اس فن میں مشیرؔ ہی کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ ہجو گوئی اور فحاشی پہلے بھی تھی مگر مشیرؔ نے جس قسم کے محاورات سے کام لیا۔ بندشِ الفاظ۔ طرزِ ادا اور تشبیہوں کے استعمال میں جیسی مضحکہ خیزی پیدا کی اور لوگوں کو مارے ہنسی کے لٹا دینے اور سامعین کے پیٹ میں بل ڈالنے کے لئے جو زبان اور جیسا اسلوب سخن اختیار کیا اس کی خوبیاں اور جدتیں بیان سے باہر ہیں۔

ابتذال میں بھی لطف پیدا کر کے اسے شائستہ لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے قابل بنا دینا ان کا خاص جوہر تھا جو ان سے پہلے اور ان کے بعد کسی کو نصیب نہ ہوا ہزل گوئی ہی کے سلسلے میں میاں چرکینؔ کا نام بھی لینا ضروری ہے۔ لکھنؤ کے زمانہ وسطیٰ میں عاشور علی خاں نام ایک زندہ دل اور نہایت ہی قابل و با مذاق رئیس تھے ان کے ہاں صحبت اس وقت کی سوسائٹی کا ایک مکمل ترین نمونہ تھی۔ انہوں نے ہی جانؔ صاحب اور چرکینؔ کو پیدا کیا اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ انہیں کی صحبت میں صاحبقران علی کا بھی نام چمکا۔

ریختی کا فن باوجود غیر مہذب ہونے کے دلچسپ ہے اور چرکینؔ کی شاعری کی طرح اذیت رساں اور غلیظ نہیں۔ مردوں اور عورتوں کے محاوروں اور لہجے میں تھوڑا بہت فرق ہر زبان میں ہوا کرتا ہے مگر اتنا نہیں جتنا ہمیں اپنی زبان میں نظر آتا ہے فارسی عربی سب زبانوں میں یہ امتیاز موجود ہے مگر اردو اس خصوصیت میں بڑھی ہوئی ہے۔ فارسی اور عربی کا ذوق پرانا تھا۔ عورتیں شعر کہتیں تو اپنی زبان میں کہتیں۔ اور مرد کبھی عورتوں کی زبان سے کوئی خیال ادا کرتے ہیں تو زبان میں لطف پیدا کرنے کے لئے ان کی زبان اختیار کرتے ہیں۔ یہی حال انگریزی کا ہے اردو شاعری ہمیشہ سے مردوں کی زبان میں رہی۔ یہاں تک کہ اس میں عورتیں کہتی بھی ہیں تو مردوں کے لہجے میں کہتی ہیں۔ مردوں ہی کی زبان اختیار کرتی ہیں اور اپنے لئے ضمیر تک مذکر استعمال کرتی ہیں۔ اگر شاعر کا نام معلوم نہ ہو تو کوئی پہچان نہیں سکتا کہ مرد یا عورت کا کلام ہے!

ریختہ کے بعد ریختی

اردو شاعری کا تیسرا یا چوتھا ہی دور تھا کہ شوخ طبع نوجوانوں میں خیال پیدا ہوا کہ ریختہ کی طرح ریختی ایجاد کی جائے میر حسنؔ نے اپنی مثنوی میں ضرورت کے موقعوں پہ یہ زبان موزوں کی تھی مگر وہاں تک مضائقہ نہ تھا۔ میاں رنگینؔ نے اس رنگ کو مستقل طور پہ اختیار کیا جو دہلی کے رہنے والے تھے اور لکھنؤ کی صحبتوں میں شریک رہا کرتے تھے۔ ابتداً مہذب لوگوں صحبت نے اس رنگ کو بے شرمی اور خلاف تہذیب جانا۔ چنانچہ سید انشاؔ کی زبانی ہم نے لکھنؤ میں دہلی کے جن مہذب سن رسیدہ بزرگ اور وہیں کی ایک رنڈی نورا کی گفتگو لکھی ہے اس میں وہ بزرگ فرماتے ہیں۔

"اور سب سے زیادہ ایک اور سنیئے کہ سعادت یار کا بیٹا انوری ریختہ اپنے کو جانتا ہے۔ رنگینؔ تخلص ہے۔ ایک قصہ کہا ہے اس مثنوی کا نام دلپذیر رکھا ہے۔ رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی ہے۔ میر حسن پر زبر لکھا ہے۔ ہر چند اس مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا۔ بدر منیر کی مثنوی نہیں کہی گئی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں۔ بھلا اس کو شعر کیونکر کہیئے! سارے لوگ دلّی کے لکھنؤ کے رنڈی سے لے کے مرد تک پڑھتے ہیں ؎

چلی وہاں سے دامن اٹھاتی ہوئی کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی

سو اس بے چارے رنگینؔ نے بھی اسی طور پہ قصہ کہا ہے۔ کوئی پوچھے کہ بھائی تیرا باپ رسالدار مسلّم۔ لیکن بچارا برچھی بھالے کا ہلانے والا تیغ کا چلانے والا تھا تو ایسا قابل کہاں سے ہوا؟ اور شہدپن مزاج میں رنڈی بازی سے آگیا ہے تو ریختہ کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے اس واسطے کہ بھلے آدمیوں کی بہو بیٹیاں پڑھ کر مشتاق ہوں اور ان کے ساتھ اپنا منہ کالا کریں بھلا یہ کام کیا ہے!

ذرا گھر کو رنگینؔ کے تحقیق کر لو

یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو؟

مرد ہو کہتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کم بخت کریں مادی جاؤں اور ایک کتاب بنائی ہے اس میں رنڈیوں کی بولی لکھی ہے۔ جس میں اوپر والیاں چیلیں۔ اوپر والا چاند۔ اجلی دھوبن وغیرہ۔ مگر مہذب بڈھے شکایت کرتے کرتے مر گئے۔ نوجوانوں کی رنگینی نے رنگینؔ مزاج کو ترقی دے ہی کے چھوڑا۔ اور ریختی اردو کا ایک فن ہو گیا جس کی ایجاد گو ایک دہلی ہی کے شاعر سے ہوئی تھی مگر لکھنؤ میں اس کا فروغ ہوا قصے کہانی کے سلسلے میں اس زبان کو میر حسنؔ کے بعد نواب مرزا شوقؔ نے جس اعلیٰ درجہ کمال کو پہنچایا اس کی تعریف نہیں ہو سکتی لیکن غزل گوئی میں رنگینؔ کی جانشینی جانؔ صاحب نے کی جو لکھنؤ کے ایک معمولی شخص تھے اور عاشور علی خاں کی خرادیہ چڑھ کے تیار ہوئے تھے۔ گو کہ جانؔ صاحب کے بعد اور ریختی گو بھی لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ مگر جانؔ صاحب پہ کمال اور شہرت کا خاتمہ ہو گیا انہوں نے غزلیں کہیں واسوخت کہی اور نظمیں بھی کہیں۔

ریختی میں اگر فحش اور بدکاری کے مذاق سے پرہیز کر کے پاک دامنی کے جذبات اختیار کئے جاتے تو یہ فن ایک حد تک قابل ترقی ہوتا۔ مگر خرابی یہ ہوئی کہ اس کی بنیاد ہی بدکاری کے جذبات اور بے عصمتی کے خیالات پر تھی۔ اس لئے ریختی گویوں کا قدم ہمیشہ جادۂ تہذیب و اعتدال سے باہر ہو گیا۔ اور اس سے زبان کو چاہے کسی حد تک فائدہ ہوا ہو مگر اخلاق کو نقصان پہنچا۔

لکھنؤ میں نثر نگاری

نثر اردو کی عمر نظم کو دیکھتے سے کم ہے۔ مدت تک تعلیم یافتہ لوگوں کی یہ وضع رہی کہ اگرچہ بعض لوگ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے مگر عام رجحان اور میلان اردو غزل سرائی کی طرف تھا اور ہندوستان میں اردو شاعروں کی تعداد فارسی شاعروں سے بہت زیادہ تھی۔ مگر نثر میں سارے ملک کو فارسی ہی میں لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ علوم و فنون کی کتابیں فارسی میں لکھی جاتیں۔ دین و مذہب کی کتابیں فارسی میں تصنیف ہوتیں یہاں تک کہ بوڑھے سے

لے کے بچے تک سب فارسی میں خط وکتابت کرتے۔ بچوں کو مکتب میں فارسی ہی کی انشائیں پڑھائی جاتیں اور فارسی ہی میں خط لکھنا سکھایا جاتا۔ نتیجہ یہ تھا کہ بول چال میں اردو زبان چاہے کیسی ہی شیریں و فصیح ہوگئی ہو لکھنے کی ضرورت پیش آئی اور سب گونگے ہوگئے۔

پہلے پہل اردو میں میرامن دہلوی نے انگریزوں کی حوصلہ افزائی و ہدایت سے اپنی کتاب چار درویش لکھی۔ اسی زمانے میں میرزا علی لطف نے اپنا تذکرۂ شعرائے اردو تصنیف کیا۔ جو عبداللہ خاں صاحب مقیم حیدرآباد کی کوشش سے چھپا۔ اسی زمانے کے قریب مولوی اسماعیل صاحب شہید نے توحید و اتباع سنت پر اپنی کتاب تقویۃ الایمان تحریر فرمائی۔ ان کتابوں کی تصنیف سے اصل مقصود یہ تھا کہ بے تکلف اور سیدھی سادی زبان میں مطلب ادا کیا جائے اور عوام فائدہ اٹھا سکیں مذکورہ بالا بزرگوں کو اگر ادب اردو کا کمال دکھانا ہوتا تو اس زمانے کی انشا پردازی کے اصول کے مطابق ظہوری و نعمت خانِ عالی اور ابوالفضل و طاہر وحید کا رنگ اختیار کرتے جو اس وقت ادبی دنیا پر حکومت کرتے تھے اور جس کے بغیر کوئی تحریر ملک میں قابل داد نہ تصور کی جاتی تھی۔ تحریر ہی نہیں گفتگو میں بھی اگر زیادہ تہذیب و شائستگی ملحوظ خاطر ہوتی تو وہی انداز اختیار کر لیا جاتا جیسا کہ سید انشا نے میرزا مظہر جانجاناں کی تقریر کے چند الفاظ نقل کر کے بتا دیا ہے۔

سچ پوچھئے تو اردو کی نثر نگاری لکھنؤ ہی سے شروع ہوئی جبکہ مرزا رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب اور اپنی دوسری کتابوں کو شائع کیا۔ اسی زمانے میں نورتن بھی لکھنؤ میں ہی لکھی گئی جس کے مصنف محمد بخش مہجور شاگرد جرأت لکھنوی کی صحبت کے ساختہ پرداختہ تھے۔

رجب علی بیگ سرور نے سچ یہ ہے۔ کہ انشا پردازی کا اعلیٰ کمال دکھایا ہے اور جس وقت وہ کتاب شائع ہوئی ہے۔ اردو صحبتوں میں حیرت کے ساتھ دیکھی گئی مگر بدقسمتی سے انہوں نے دیباچے میں میرامن پر حملہ کر دیا تھا جس کی وجہ سے ان کے تمام کمالات اہل دہلی کے نزدیک خاک میں مل گئے۔ یہاں تک کہ مولانا محمد حسین آزاد کے سے مہذب بزرگ بھی انہیں "لکھنؤ کا شہدا" فرماتے ہیں۔

اور معلوم نہیں رجب علی بیگ مرحوم سے اس گستاخی کا انتقام کب تک لیا جائے گا۔

میرامن کا ہنر انشا پردازی انگریزوں کو ان دنوں چاہے نظر آگیا ہو۔ مگر ہندوستان کے اہل زبان میں سے کسی کو نہ نظر آیا تھا۔ اور نہ نظر آسکتا تھا۔ اس لئے کہ انگریزی تعلیم کے اثر نے اس وقت تک ملکی لٹریچر کا مذاق نہیں بدلا تھا اور مشرقی ادب خیالوں اور دماغوں میں بسا ہوا تھا۔

ادبی رنگ کے متعلق کہنا یہ ہے کہ وہ بالکل تعلیم اور مذاق کی پرورش سے وابستہ ہوتا ہے۔ جس طرح غذاؤں۔ خوشبوؤں اور رنگوں اور دیگر تمام چیزوں کو گرد کی معاشرت پسندیدہ بنایا کرتی ہے اور مختلف قوموں اور ملکوں میں اس قدر اختلاف رہتا ہے کہ ایک کا لذیذ ترین اور محبوب ترین چیز دوسرے کے نزدیک نہایت ہی بدمزہ اور سخت قابل نفرت ہوتی ہے۔ ویسے ہی ادب اور لٹریری مذاق کا حال ہے کہ جو رنگ ایک قوم میں پرورش پا کے دماغوں اور زبانوں پر چڑھ جاتا ہے دوسری قوم کے نزدیک بے ہودہ بے لطف اور بدمزہ ہوتا ہے اور صحیح فیصلہ کوئی نہیں کر سکتا کہ کون اچھا ہے اور کون برا ہے۔

جاہلیت عرب میں فصاحت و بلاغت کا رنگ یہ تھا۔ کہ مقفیٰ فقرے لائے جائیں۔ عبارت میں متناسب و متداول الفاظ مترادف آئیں۔ اور ایک ہی مطلب برابر ادا کر کے موثر اور دلچسپ بنایا جائے۔ اسی مذاق کو قرآن نے چونکہ وہ لسانی قوم میں تھا۔ نہایت معجز نما طرز سے تکمیل کو پہنچایا۔ پھر وہی مذاق عربی کا عنصر اعظم بن گیا۔ آج کل کے معیار سے دیکھا جائے۔ تو عربی کی فصیح ترین کتب یعنی مقاماتِ حریری و تاریخ تیموری وغیرہ میں قافیہ پیمائی۔ تطویل بیجا اور بے ضرورت الفاظ لانے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جس کا مدتوں اور صدیوں تک ایک دنیا مزہ لیتی رہی ہے۔ یہی رنگ فارسی کے ادیبوں نے اختیار کیا اور جوں جوں ادبی ترقی ہوتی گئی وہی رنگ پختہ اور گہرا ہوتا گیا۔ اور اس مذاق کے دماغوں میں بسے ہونے کی وجہ سے وہی رنگ اردو کے اُدبائے اولین نے اختیار کیا اور دنیا سے داد پائی۔ لہٰذا یہ خیال کرنا کہ چار درویش جن دنوں لکھی گئی ہے۔ ان دنوں وہ سوا انگریزوں کو پسند ہوتے کے جو اردو کو جانتے ہی نہ تھے ہندوستان کے اہل علم میں کوئی ادبی کمال تصور کی گئی ہوگی بالکل بے اصل ہے۔ اب انگریزی کے اثر سے بے شک ایسا زمانہ آگیا ہے جب اردو کو پرانے لٹریچر نے جو زیور اور لباس پہنایا تھا۔ اتار لیا گیا اور نئے مغربی کپڑے پہنائے گئے۔ چار درویش اور اس کی سی دوسری کتابیں چونکہ پرانے ادبی زیور و لباس سے معریٰ تھیں۔ اس لئے لوگوں کو پسند آئیں اس لئے نہیں کہ ان میں کوئی خاص خوبی تھی بلکہ اس لئے کہ اسی پرانے مقبول عام قومی لٹریچر کے رنگ سے معریٰ تھیں۔ جو موجودہ لوگوں کو ناپسند ہے۔

اسی زمانے میں لکھنؤ میں مولوی غلام امام شہید نے اپنا مشہور مولد شریف لکھا جو اس وقت کے ادبی مذاق میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ لوگوں کو بہت پسند آیا اور مذہبی مقبولیت کی وجہ سے آج تک بہت پسند ہے۔

مگر موجودہ نثر اردو اصل میں دہلی ہی سے نکلی اور ہمیشہ دہلی کی زیر بار احسان رہے گی۔ مرزا غالب نے اردو انشا میں بے تکلفی کا رنگ اختیار کیا جو موجودہ مذاق سے بہت ہی قریب ہے۔ اگرچہ وہ بھی کبھی کبھی قافیہ بندی کی رعایت کر جاتے ہیں۔ لیکن اس بے تکلفی کے ساتھ کہ پڑھنے والے کو قافیہ کا خیال بھی غور کرنے سے آتا ہے۔ موجودہ تعلیم نے لوگوں کو اس رنگ کو قبول کرنے کے لئے خوب تیار کر دیا تھا۔ ہر محفل میں واہ وا ہونے لگی۔ ان کے بعد سر سید نے اس سادگی میں متانت پیدا کر دی مگر اس کوشش کے ساتھ کہ زبان دقیق نہ ہونے پائے اور ایسی رہے کہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ سمجھ سکے۔ مولوی محمد حسین آزاد نے اس سادگی اور متانت کے ساتھ لطف پیدا کر دیا جبکہ لکھنؤ کے لوگ انگریزی اثر سے دور ہونے کے باعث ہنوز پرانے ہی رنگ کے دیوانے تھے۔ یہاں واجد علی شاہ کے آخری ایام زندگی تک رنگین اور مقفیٰ عبارت لکھی جاتی تھی اور لوگوں کو اس سادگی کی عادت نہیں پڑی تھی۔

تہذیب الاخلاق اور اودھ پنچ۔

اب علیگڑھ سے تہذیب الاخلاق اگرسے تیرھویں صدی اور لکھنؤ سے اودھ پنچ نکل رہے تھے جن میں سے ہر ایک نثر اردو کی ممتاز شان رکھتا تھا۔ تہذیب الاخلاق میں متانت اور عالمانہ وقار کے ساتھ قومی درد کا سوز و گداز تھا۔ سلجھی ہوئی صاف زبان تھی اور نئے مغربی فلسفہ و ادب سے لئے ہوئے خیالات اور اثر ڈالنے والے مضامین و خطبات تھے۔ تیرھویں صدی میں اعلیٰ منشیانہ قابلیت کے ساتھ قدیم ادبی مذاق کی نگہداشت نئی خیال آرائیوں اور جدتوں کے ساتھ کی جاتی تھی اور پرانا

مشرقی لٹریچر کچھ ایسی جدت طرازیوں کے ساتھ نئے لباس میں ظاہر کیا جاتا تھا کہ نئے اور پرانے دونوں گروہوں سے بے اختیار واہ وا کے نعرے بلند ہوتے تھے۔

اودھ پنچ میں زبان اپنی اصلی شان میں دکھائی جاتی تھی جس میں مذاق کا پہلو غالب رہتا اس میں مختلف لکھنے والے تھے اور ہر ایک کا مذاق خاص لطف اور خاص خوبیاں رکھتا تھا منشی سجاد حسین ایڈیٹر کی شوخیاں۔ مرزا مچھو بیگ کی کوثر کی دھولی ہوئی زبان۔ منشی احمد علی کسمنڈوی کی فارسیت کی اعلیٰ ادبی اور شاعرانہ چھپیاں ظاہر کرنے والا رنگ۔ پنڈت تربھون ناتھ ہجر کی ہندی نظمیں اور ان کی خوبیوں کو نہایت دلچسپی کے ساتھ ظاہر کرنے والے مضامین اردو نثر میں ایک عجیب زندگی و شگفتگی پیدا کر رہے تھے۔

اسی اثنا میں اودھ اخبار کے ساتھ پنڈت رتن ناتھ کا ناول "فسانۂ آزاد" شائع ہونا شروع ہوا۔ جس نے ملک پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ اور اردو دنیا ناول نویسی کے مذاق سے آشنا ہو کے اس کی بے انتہا فریفتہ ہو گئی۔ فسانۂ آزاد میں جہاں مصنف نے اپنے قلم سے کوئی سین دکھایا ہے یا کوئی واقعہ لکھا ہے۔ وہی فسانۂ عجائب کا پرانا رنگ ترقیوں کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ اور جہاں دوسروں کی زبان سے گفتگو کرائی ہے بہت ہی سادہ اور بے تکلف زبان رکھی ہے۔ خصوصاً عورتوں کی زبان بہت ہی پاکیزہ ہے۔ گو کہ جا بجا غلطیاں بھی ہو گئی ہیں۔ مگر سچ یہ ہے۔ کہ اپنی کوشش میں وہ جس درجے تک پہنچ گئے ہیں ان سے پہلے کوئی نہیں پہنچا تھا۔

یہی زمانہ ہے جبکہ مولوی نذیر احمد صاحب نے گورنمنٹ کی فرمائش پر تعزیرات ہند کا ترجمہ کیا اور اپنی کتابوں کے ذریعے سے ایک ایسی زبان ملک کے سامنے پیش کی جو کہیں روانی اور صفائی میں بے نظیر ہے اور کہیں لغاتِ عربی سے مملو ہونے کے باعث سخت دقیق و بلیغ۔ اور اسی عہد میں مولوی محمد حسین صاحب آزاد کا لٹریچر ایک بہت ہی پسندیدہ رنگ پیش کر رہا تھا۔ خصوصاً انہوں نے زبان اردو کی تاریخ اور تذکرۂ شعرائے اردو لکھ کے ادب اردو میں خاص ناموری حاصل کی۔

اسی زمانہ میں ۱۸۸۲ء میں محشر نام ایک ہفتہ وار رسالہ میں نے مولوی محمد عبدالباسط صاحب محشر کے نام سے نکالا۔ جس کے ذریعے ایڈیسن کا رنگ اردو میں ایسے دلکش عنوان اور موزوں و مناسب الفاظ و خیالات میں پیش کیا گیا کہ ملک یک بیک چونک سا پڑا۔ ساتھ ہی میرے مضامین اودھ اخبار کے کالموں میں شائع ہونا شروع ہوئے جنہوں نے ملک کے سامنے ایک بالکل نیا لٹریچر پیش کیا۔ جو اس قدر مقبول ہوا کہ ہر طرف سے مرحبا کی صدائیں سنی جانے لگیں۔ یکایک نظر آیا کہ اکثر مضمون نگار اسی رنگ کو اختیار کر رہے ہیں۔ اور ملک کا عام رجحان اسی طرف ہے۔ اسی درمیان میں میں نے اپنا ناول دلچسپ اور مؤثر ڈرامہ شہید وفا ملک کے سامنے پیش کیا۔ اور ہر طرف سے حوصلہ افزائی ہونے لگی۔

آخر ملک کا اصرار و تقاضا دیکھ کے آغاز ۱۸۸۷ء سے میں نے رسالہ "دل گداز" جاری کیا۔ جس کا لٹریچر انگریزی والوں اور پرانے مذاق کے لوگوں دونوں میں مقبول ہوا۔ پھر ۱۸۸۸ء سے اس کے ساتھ تاریخی ناولوں کا سلسلہ جاری کیا گیا جن میں سب سے پہلا ناول "ملک عبدالعزیز ورجنا" ہے۔ ان ناولوں کو ملک نے جس شوق سے لیا۔ اس کے بیان کرنے کی تو ضرورت نہیں ہے۔ مگر اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ انہیں ناولوں کی وجہ سے واقعات نئے معلوم کرنے اور کتابوں کے مطالعے کا شوق بڑھنے کی بنیاد پڑی۔ انہیں ناولوں کے ذریعے سے ملک میں تاریخ کے پڑھنے اور واقعات عالم سے دلچسپی حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور انہیں ناولوں اور "دلگداز" کے صفحوں نے وہ رنگ پیدا کیا۔ جس پر موجودہ ادب اردو کی بنیاد قائم ہے۔ بہرحال نثر اردو کا تعلق جہاں تک پرانے ادبی رنگ سے ہے۔ اس کی بنیاد لکھنؤ میں پڑی ہاں جدید رنگ کا آغاز دہلی سے ہوا۔ مگر اس کوشش میں جہاں تک ممکن ہوا لکھنؤ نے دہلی کی رفاقت کی۔ خصوصاً ظرافت کا مذاق تو لکھنؤ ہی سے پیدا ہوا اور لکھنؤ میں تکمیل کو پہنچا۔

داستان گوئی

لیکن زبان اردو کو جو ترقیاں لکھنؤ میں حاصل ہوئیں شاعروں ادیبوں۔ نثاروں اور مصنفوں ہی تک محدود نہیں ہیں مختلف سوسائٹیوں اور طبقوں میں ترقی و وسعت زبان کی نئی نئی صورتیں پیدا ہوئیں۔ جنہوں نے ہر گروہ والوں کے لئے خاص دلچسپیاں پیدا کیں۔

ان میں سب سے زیادہ قابل توجہ داستان گوئی ہے۔ جو در اصل فی البدیہہ تصنیف کرنے کا نام ہے۔ یہ فن اصل میں عربوں کا ہے جہاں عہد جاہلیت میں بھی داستان گوئی کی صحبتیں مرتب ہوا کرتی تھیں۔ لیکن ہندوستان کی داستان گوئی کی نسبت ہم نہیں جانتے کہ عرب کی قصہ خوانی سے ان کا کوئی رشتہ ہے یا نہیں۔ امیر حمزہ کی داستان جو داستان گوؤں کی اصلی اور حقیقی جولان گاہ ہے۔ وہ در اصل فارسی میں تھی اور کہتے ہیں کہ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں امیر خسرو نام ایک قابل شخص نے اسے تصنیف کیا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ طوک تغلق کے عہد میں داستان امیر حمزہ موجود تھی۔

دہلی کے مشہور داستان گو لکھنؤ میں آنا شروع ہوئے۔ یہاں افیونیوں نے ان کی یہاں تک قدر کی۔ کہ داستان سننے کو اپنی صحبتوں کا ایک عنصر اعظم قرار دے لیا۔ چند ہی روز میں لکھنؤ کے اندر اس کو اس قدر فروغ ہو گیا۔ کہ کوئی دولت مند نہ تھا۔ جس کی سرکار میں کوئی داستان گو نہ مقرر ہو۔ سیکڑوں داستان گو پیدا ہو گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے آج کل کے مقبول سے مقبول اسپیکروں میں سے ابھی تک کسی کو فصیح البیانی میں وہ درجہ نہیں نصیب ہو سکا ہے جو قادر الکلام داستان گوؤں کو حاصل تھا۔

لکھنؤ کے داستان گو

دہلی میں بھی دو ایک صاحب کمال داستان گو آج تک پڑے ہیں۔ مگر لکھنؤ میں ان کا شمار بہت زیادہ ہے اور ان کے طرز تقریر کا اثر عوام شہر کی زبانوں پر بے حد پڑ گیا ہے۔ ناولوں کا ذوق پیدا ہونے کے بعد جب اس بات کی کوشش کی گئی کہ داستان کو داستان گوؤں ہی کی زبان میں قلم بند کرا لیا جائے تو لکھنؤ ہی ایسے باکمال داستان گو پیش کر سکا۔ جنہوں نے ضخیم جلدیں لکھ کے اردو دان پبلک میں پھیلا دیں چنانچہ جاہ اور قمر کی تصانیف ملک میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں داستان کے چار فن قرار پا گئے ہیں۔

(۱) رزم

(۲) بزم

(۳) حسن و عشق

(۴) عیاری

ان چاروں فنون میں لکھنؤ کے داستان گوؤں نے ایسے ایسے کمال دکھائے ہیں جن کا اندازہ بغیر دیکھے اور سنے نہیں ہو سکتا۔ الفاظ میں تصویر کھینچنا اور

تصویروں کا نہایت گہرا اور پائدار اثر سامعین کے دلوں پر ڈال دینا ان لوگوں کا خاص کمال ہے۔

سوشل تفنن۔ مذاق ظرافت اور دل لگی کے عنوان سے بھی لکھنؤ میں علم زبان کے کئی فن پیدا ہو گئے جن میں کوئی مقام لکھنؤ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

انہیں میں سے ایک فن پھبتی کہنا ہے۔ اس کو دراصل شاعرانہ تشبیہ و استعارے سے تعلق ہے۔ لیکن اس میں اتنی خصوصیت ہے کہ ہر کسی کو بگاڑ کے دکھائے۔ اس کے عیب کے نمایاں کرنے اور برجستہ گوئی انوکھی ہنسانے والی اور عیب و نقصان ظاہر کرنے والی تشبیہ پیش کر دینے تک محدود ہے۔ لکھنؤ کے ادنیٰ ادنیٰ لڑکے بازاری عورتیں، جاہل دکاندار۔ ادنیٰ طبقوں کے اہل حرفہ تک ایسی برجستہ پھبتیاں کہہ جاتے ہیں کہ باہر والوں کو حیرت ہو جاتی ہے۔ ایک صاحب کربلائے معلیٰ کی زیارت کر کے واپس آئے۔ اور بُراق کپڑے پہن کے دوستوں میں آکر بیٹھے ہی تھے کہ ایک لونڈے نے کہا۔ ابے یہ فرات کا بگلا کہاں سے آگیا؟ ایک بوڑھے دولھا خضاب کر کے دلھن کو بیاہنے آئے اور بڑی دھوم سے برات لائے زنانے سے نکل کے وہ محفل میں آرہے تھے۔ جوتا اتارنے کے لئے جھکے اور چند قدم فرش پر گھٹنے ٹیک کے چلے کسی کی زبان سے نکلا۔ دولھا کہاں ہیں؟ شوخ مزاج ڈومنی جو کھڑی مجرا کر رہی تھی ہنس کے بولی۔ اے وہ میئوں میئوں چلا تو آتا ہے۔

ایک کبڑا چوک میں پونڈے بیچ رہا تھا۔ صدا یہ تھی کہ ارے بھئی یہ کنکوے کون لوٹے گا؟ کیا اس سے زیادہ بامذاق استعارہ ہو سکتا ہے! نازک ترین استعارہ وہ ہے۔ جس میں مشبہ اور مشبہ بہ دونوں کا نام نہ لیا جائے۔ صرف مشبہ بہ کی کوئی خصوصیت بتا کے کلام میں لطف پیدا کر دیا جائے۔ اس کی اس سے بہتر مثال کون ہو سکتی ہے؟ کہ پونڈے کا نام لیا، نہ لگّے کا۔ جس سے کنکوے لوٹے جاتے ہیں۔ صرف اتنا کہہ کے کہ کنکوے کون لوٹے گا؟ یہ بتا دیا۔ کہ یہ پونڈے لگّوں کے برابر ہیں جن سے کنکوے لوٹے جاتے ہیں اور پھر اس سے زیادہ مناسب اور بازاری لوگوں کے مذاق کی کوئی تشبیہ نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح کی صدہا ہزارہا مثالیں ہیں جو یہاں کی صحبتوں میں اٹھتے بیٹھتے ہر وقت سنی جاتی ہیں۔

اہل لکھنؤ کی ضلع جگت

دوسرا "ضلع" ہے۔ یہ دراصل شاعرانہ رعایت ہے جس نے عوام کی بات چیت اور مذاق کی گفتگو میں آکے خاص رنگ پیدا کر لیا ہے۔ ضلع میں کوشش کی جاتی ہے کہ جس چیز کا تذکرہ آجائے اس کے تمام متعلقات کسی نہ کسی پہلو سے باتوں میں بے آئے جائیں۔ آزاد فقیر جو ایک خاص وضع رکھتے تھے۔ ضلع بولنے میں باکمال مانے جاتے تھے۔

امانت نے اپنی شاعری میں رعایت کی اس قدر کوشش کی کہ تمام شاعرانہ خوبیوں سے قطع نظر کر کے رعایت ہی کو اپنا مقصد قرار دے لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا کلام شاعری کے درجے سے نکل کے ضلع بولنے کے حکم میں داخل ہو گیا۔ مگر لکھنؤ کے اکثر عوام نے اپنی بے تکلفی کی صحبتوں میں اس فن کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ امانت کی شاعری پیچھے پڑ گئی۔ سچ یہ ہے کہ کسی جگہ کے لوگ ضلع بولنے میں اہل لکھنؤ کے عشر عشیر درجے کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اس فن میں ایک کتاب بھی شائع ہو گئی۔

تیسرا فن تک بندی ہے۔ یہ شاعری کی قافیہ پیمائی ہے۔ بہت سے جاہل جب ادھر توجہ کرتے ہیں۔ تو جواب سوال میں اس طرح فی البدیہہ قافیہ استعمال کرتے ہیں کہ بڑے بڑے شعرا کو حیرت ہو جاتی ہے۔ ہم نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں ایک ہندو بڑھیا کے کاتنے والا دیکھا تھا جو صبح کو خوانچہ لگا کے نکلتا۔ صورت دیکھتے ہی صدہا بازاری لونڈے اسے گھیر لیتے اور وہ سر راہ خوانچہ رکھ کے بیٹھ جاتا۔ فوراً گوئنڈوں کا اس سے تک بندی میں مقابلہ شروع ہو جاتا۔ سارا مجمع ایک طرف ہوتا۔ فریقین میں گالیوں کی بوچھاڑ ہوتی مگر شرط تھی کہ کوئی گالی تک سے باہر نہ ہو۔ اور کوئی قافیہ رہ نہ جائے۔ ہم نے اسے بیسیوں بار دیکھا گھنٹوں اس سے مقابلہ رہتا۔ مگر ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ جواب میں کبھی عاجز رہا ہو کوئی نہ کوئی قافیہ ڈھونڈ کے پیش ہی کر دیتا تھا۔ اسی طرح مذاق اور گفتگو میں طرح طرح کی خیال آفرینیاں ہوتی تھیں۔ اور جاہل عوام بعض وقت ایسے خیالات پیش کر دیا کرتے تھے کہ بڑے بڑے شعرا حیرت میں رہ جاتے۔

یہ زمانہ دراصل لکھنؤ کا سنہری دور تھا۔ شاعری اور ادبی خوبیاں لوگوں کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھیں۔ ہر شخص جو معمولی طور پر پڑھنے میں شُدبُد رکھتا تھا طبع آزمائی شروع کر دیتا۔ ان پڑھ عوام اور گھر میں بیٹھنے والی خواتین تک میں شاعرانہ لوچ اور ادبی نزاکتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ جہلا کی زبان بھی اس قدر شستہ اور صاف اور تمدنی آداب سے لبریز تھی کہ اکثر صاحب علم ان کی گفتگو سن کر ششدر رہ جاتے تھے اور کسی کو ان پر جاہل ہونے کا گمان بھی نہ ہوتا۔ سودا بیچنے والوں کی صدائیں شاعرانہ نکات اور فصاحت و بلاغت سے اس قدر آراستہ تھیں کہ اوروں کو سمجھنا بھی دشوار تھا۔

ادنیٰ طبقے کے لوگوں نے بھی اپنے مذاق کے مطابق خاص ادبی دلچسپیاں پیدا کر لی تھیں۔ مثلاً ایک فن خیال کا پیدا ہو گیا۔ لوگ فی البدیہہ اشعار تصنیف کر کے دائرے پر گاتے۔ اس کا نام خیال اس لئے رکھا گیا کہ ہر شخص اپنی تحصیل کا جوہر دکھائے اور کوئی نئی بات پیدا کرے۔ اس فن میں یہاں بہت سے باکمال پیدا ہوئے جن کو اعلیٰ سوسائٹی اور تعلیم یافتہ لوگوں کی صحبتوں سے کوئی تعلق نہ تھا مگر بجائے خود اگر غور کیجئے تو وہ اصلی اور فطری شاعری تھی اور اسی وضع کی شاعری جیسی کہ عہد جاہلیت میں عرب میں تھی۔

اسی طرح ایک گروہ ڈنڈے والوں کا پیدا ہو گیا۔ ان لوگوں کی یہ شان تھی کہ قریب کے زمانے کے اہم اور مشہور واقعات کو کمال آزادی کے ساتھ موزوں کرتے۔ جو جیسا ہوتا چاہے وہ کتنا ہی بڑا صاحب اثر اور دولت مند ہو اسے ویسا ہی بڑی بے باکی سے دکھاتے اور ثابت کرتے کہ ملک و قوم کو اس سے کیا فائدہ ہوا یا کتنا نقصان پہنچا۔ پھر اپنی ان نظموں کو ایک شعر خوانی کی خاص وضع میں ڈنڈے بجا بجا کر سناتے۔

عورتوں کی زبان مردوں کے مقابلے میں ہر ملک اور ہر قوم میں زیادہ شستہ اور دلکش ہوتی ہے۔ مگر لکھنؤ میں یہ خاص بات تھی کہ محلات اور محترم خاندان کی معزز بیگموں کی زبان میں علاوہ نسائی دل فریبیوں کے ادبی اور شاعرانہ نزاکتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ باتیں کرتیں تو معلوم ہوتا کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں اور غور کیجئے تو صحت الفاظ پیاری بندشیں اور طرز ادا کی نزاکتیں بتاتیں کہ زبان کی خوبیاں اس سرزمین میں کس اعلیٰ کمال کو پہنچ گئی ہیں۔

علوم و فنون

زبان اور شاعری کے کمالات کے ساتھ لکھنؤ نے علم و فضل میں بھی ہندوستان کے تمام شہروں سے زیادہ ترقی کی۔ اگر سچ پوچھئے تو علوم کے اعتبار سے لکھنؤ ہندوستان کا بغداد و قرطبہ اور مشرق کا نیشاپور و بخارا تھا

یہاں کے علم وفضل کا آغاز علمائے فرنگی محل سے ہوا جن کے حالات کو ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔ علم بے شک یہاں دہلی سے آیا ہوگا۔ لیکن پرانے زمانے میں علمائے دہلی میں سے صرف ایک شیخ عبدالحق نظر آتے ہیں جنہوں نے حدیث اور دینی علوم میں شہرت دوام حاصل کی۔ فرنگی محل کے سے کسی دارالعلوم کا وہاں کسی زمانے میں پتا نہیں لگتا۔ وہاں فرنگی محل کے مشہور ہو جانے کے بعد دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحب کا خاندان البتہ بہت مشہور ہوا۔ جن کے فیض و برکت سے آج ہندوستان کے تمام شہروں میں علم حدیث کی تعلیم جاری ہوئی لیکن اگر علم حدیث کی تعلیم اس نامور خاندان دہلی کی یادگار ہے تو اس کے ساتھ ہی صرف ونحو۔ منطق وحکمت۔ اور معانی وبیان اور دیگر فنون درسیہ کی تعلیم لکھنؤ کی نامور یونیورسٹی فرنگی محل کی یادگار ہے۔

غائر نظر ڈالنے اور جستجو سے صاف پتا چلتا ہے کہ جیسے علماء لکھنؤ اور خاص فرنگی محل میں پیدا ہوئے کبھی کسی زمانے میں اور کسی جگہ ہندوستان میں نہیں پیدا ہو سکے تھے۔ اس کا قطعی ثبوت یہ ہے کہ سلسلۂ درس میں جو کتابیں جاری ہیں وہ یا تو سلف کے ناموران عجم کی تصنیف ہیں یا فرنگی محل والوں کی یا ان لوگوں کی جنہوں نے فرنگی محل سے فیض حاصل کیا تھا۔

مجتہدین شیعہ کا آغاز بھی فرنگی محل سے ہوا۔ لکھنؤ کے پہلے مجتہد مولوی دلدار علی صاحب نے بھی شروع شروع میں درسیہ کتب فرنگی محل ہی میں پڑھی تھیں پھر عراق میں جا کے علمائے کربلا ونجف کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا اور واپس آ کے خود فرنگی محل والوں کی تصدیق سے مجتہد اور شیعہ فرمانروایان وقت کے مقتدا قرار پائے۔ انہوں نے چونکہ عراق میں تعلیم پائی تھی۔ لہٰذا عربی کا نیا ادبی ذوق اپنے ساتھ لائے اور ادبیت میں خاندان اجتہاد اور لکھنؤ کے شیعہ علما کو فرنگی محل والوں پر ہمیشہ فوقیت حاصل رہی اور آج تک حاصل ہے۔

علما شیعہ کے ادبی مذاق نے لکھنؤ کو ادب کی تعلیم کا اعلیٰ ترین مرکز بنا دیا جس نے مفتی میر عباس صاحب کا ایسا ادیب گراں پایہ پیدا کیا۔ علوم دینی میں سے فقہ۔ اصول فقہ۔ کلام اور عقائد ہیں۔ علوم ادبیہ میں سے نحو وصرف اور معانی وبیان ہیں۔ علوم عقلیہ میں سے منطق، فلسفہ۔ طبیعات والہیات ہیں۔ اور علوم ریاضی میں سے اقلیدس اور ہیئت میں علمائے فرنگی محل کو خاص ناموری حاصل تھی۔ اور سارے ہندوستان میں ان علوم کی تعلیم کا مرکز اصلی لکھنؤ تھا۔ ادب شاعر اور عروض عربی کو شیعہ علما ومجتہدین لکھنؤ نے اپنا لیا تھا۔

مناظرہ جس سے ہماری مراد یہاں خاص کلامی اور شیعہ سنی کا باہمی رد وقدح ہے۔ اس فن کا آغاز ہندوستان میں قاضی نور اللہ شوستری سے ہوا۔ جو ایران سے خاص اس لئے آئے تھے کہ سنیوں کی تردید کریں۔ جب ہی سے یہاں شیعہ سنی جھگڑے پیدا ہو گئے اور آخر قاضی صاحب کے ایک مدت بعد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے شیعوں کی رد میں تحفۂ اثنا عشریہ لکھی۔

علوم دینی میں سے لکھنؤ میں تفسیر۔ حدیث۔ رجال اور تاریخ کی کمی تھی۔ ان میں سے تفسیر کا فن ایک معمولی درجے تک لکھنؤ میں موجود تھا اور جتنا تھا اس سے زیادہ اور بھی کہیں نہ تھا۔ تاہم بعض شہروں میں بعض نامور مفسر گزرے ہیں مگر ان کا علمی کمال محض ان کی ذات تک محدود رہا اور انہیں پر ختم ہو گیا۔ حدیث کو دہلی ہی کے ساتھ خصوصیت رہی۔ آخر عہد میں مولانا محمد عبدالحی مرحوم مکہ معظمہ کے شیوخ حدیث سے درس وروایت حدیث کی سند حاصل کر کے آئے اور سلسلۂ درس بھی جاری کر دیا۔ مگر اس فن کا یہاں اچھا نشوونما نہیں ہوتے پایا۔ رجال کا فن حدیث کے تابع ہے۔ حدیث میں جس قدر توغل بڑھتا ہے۔ اسی قدر فنِ رجال میں انسان کی بصیرت بڑھتی جاتی ہے۔ لہٰذا علمائے لکھنؤ جس قدر حدیث کے فن میں ناقص تھے۔ اسی قدر رجال میں بھی ناقص رہ گئے۔ باقی رہی تاریخ اس فن کو افسانہ خوانی سے زیادہ وقعت کبھی نہ دی۔ جس کی وجہ سے عموماً علما میں ایک بہت بڑا نقص رہ جاتا تھا اور یہی چیز تھی جس نے ہندوستان کے بچے بچے کے ذہن میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ عالموں کو زمانہ شناسی سے کیا کام؟

وہ لوگ تو سیدھے سادے جنتی ہوتے ہیں۔ لیکن زمانے کی صورتیں دیکھ کے دونوں فریق کے علماء نے اپنے نصابوں میں مناسب اضافہ شروع کر دیا ہے اور دوسری طرف ندوۃ العلماء کا دارالعلوم قائم ہے جو ان ضروری علوم کی طرف خاص توجہ کر رہا ہے جو اس وقت تک متروک تھے۔ لیکن ان نقصانات کے ساتھ بھی لکھنؤ میں جو کچھ ہوا دیگر مقامات سے بہت زیادہ ہے۔ شیعہ خاندان اجتہاد اور فرنگی محل کے علمائے اہل سنت کی برکت سے اس آخری دربار کے عہد میں علم وفضل نے لکھنؤ میں ایسا عروج حاصل کیا اور اپنی سواد میں کیسی علمی کشش اور مرجعیت پیدا کرا دی۔

لکھنؤ کے حکماؑ

اب یونانی طب سے بحث کرنا ہے

یہ شریف ترین فن جس کو عالم انسانی کے محفوظ رکھنے اور نسل انسانی کو ترقی دینے سے واسطہ ہے گو کہ اس کا ظہور ہر قدیم ملک میں خود دو طریقے اور جزئی تجربات سے ہوا ہے۔ مگر قدیم الایام میں مغرب کی طرف اہل یونان نے اس فن میں بہت ہی نمایاں ترقی کی تھی۔ اور مشرق میں ہندوؤں کے ناموران سلف نے اسے اعلیٰ درجۂ کمال پر پہنچا دیا تھا۔ مسلمانوں میں جب دربار خلافت قائم ہوا تو یہ فن دونوں جگہوں سے آیا اور دونوں سرزمینوں کے حاذق اطبا دربار بغداد کے طبیب تھے۔ ابتدا غرد و ایک صدیوں تک تمام مستند اطبائے دربار عباسی ہندو تھے۔ عیسائی تھے۔ یہودی تھے مگر مسلمان نہ تھے۔ مگر اس دور کے اطبائے باکمال چاہے کسی مذہب کے پیرو ہوں۔ آغوش اسلام کے پروردہ اور عالم اسلامی کے ممتاز نامور تھے اور انہیں کے ہاتھوں سے فن طب ایک نئی شان اور نئے عنوان سے مدوّن ومنضبط ہونا شروع ہوا جس میں تھوڑی اصلاح اور ردّ وبدل کے بعد اصولی ترتیب تو یونانیوں کی برقرار رکھی گئی، مگر تجربات ہر ملک اور ہر قوم کے یکساں طور پر لئے گئے۔

اس کے چند روز بعد مسلمان اطبائے نامور پیدا ہونا شروع ہوئے اور انہوں نے فن طب کو اپنے اجتہادوں اور اپنے تجربات سے اپنا بنانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ابن سینا نے قانون کی سی بے نظیر لاجواب کتاب لکھ کے دنیا کے ہاتھ میں دے دی۔ اور اس کے آگے مشرق ومغرب کی تمام قوموں نے سر جھکا دیا۔ ادھر دربار اندلس نے عمل بالید اور تجربات میں مشرق سے بھی

زیادہ ترقی کی۔ اور فن طب مسلمانوں کا خاص فن بن گیا۔ جس کے مرجع و ماویٰ ہر جگہ وہی تھے۔ ہر قوم اسے انہیں سے حاصل کر رہی تھی اور اسی پر یورپ کی موجودہ ڈاکٹری کی عمارت قائم ہوئی۔ جس کو زیادہ تعلق اندلس کے اسلامی اسکول سے تھا۔

لیکن ادھر آخری صدیوں میں جب مسلمانوں کا زوال شروع ہوا۔ تو اس کا اثر سب سے پہلے ان کے علوم و فنون میں اور سب سے زیادہ فن طب میں نمایاں ہوا اور اکثر ممالک میں اس کی وہی حالت ہوگئی جو عروج یونان کے آغاز میں تھی۔ یعنی معمولی قابلیت کے لوگ بغیر اس کے کہ فن کی اعلیٰ ترین کتابوں پر ان کی نظر پڑی ہو۔ اپنے جزئی تجربوں سے لوگوں کا علاج کرنے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی روز میں مصر و عرب۔ شام و عراق فن جاننے والے طبیبوں سے خالی ہوگئے۔ صرف ایران اور ہندوستان میں یہ فن باقی تھا۔ لیکن اس پچھلی صدی میں ایران بھی طبیبوں سے خالی ہوگیا۔ اور تمام ممالک اسلام میں اپنے اس فنِ قدیم کے متعلق ایسی جہالت تھی کہ جب یورپ کے فرانسیسی اور انگریز ڈاکٹر نمودار ہوئے تو عوام و خواص سب کو ایک نعمتِ الٰہی نظر آئے اور کسی کو اس کی حس نہ تھی کہ یہ اصلی فن ہمارا ہی تھا۔ یا ہمارے یہاں بھی کبھی اطبا ہوتے تھے مسلمانوں کی طب کو اگر فنا ہونے سے بچایا تو صرف ہندوستان نے جہاں تک اطبائے یونانی یورپ کی جدید اصناف طب کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اور باوجودیکہ خیراتی ہسپتال گاؤں گاؤں میں موجود ہیں۔ مگر پھر بھی لوگوں کو جو اعتبار یونانی اطباء کے علاج پر ہے ڈاکٹروں پر نہیں۔

مسلمانوں کی طب کو اگر فنا ہونے سے بچایا تو صرف ہندوستان نے۔ جہاں تک اطبائے یونانی یورپ کی جدید اصنافِ طب کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اور باوجودیکہ خیراتی ہسپتال گاؤں گاؤں میں موجود ہیں مگر پھر بھی لوگوں کو جو اعتبار یونانی اطباء کے علاج پر ہے ڈاکٹروں پر نہیں۔

دہلی میں اگلے دنوں اس فن کے بہت سے باکمال گزرے جن میں حکیم ارزانی حکیم شفائی خان۔ حکیم علوی خان۔ حکیم محمد شریف خان بہت اعلیٰ شہرت و کمال کے اطبا گزرے ہیں۔ لکھنؤ میں برہان الملک کے زمانے سے دہلی کے حاذق اطبا سرزمین اودھ میں آنا شروع ہو گئے۔ خصوصاً شجاع الدولہ کے عہد میں تو دہلی کے دو ایک طبیبوں کے سوا جتنے تھے۔ سب یہیں چلے آئے۔ فیض آباد کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ وہاں جتنی سرکاریں تھیں ان میں سے ہر ایک سے کوئی یونانی طبیب ضرور وابستہ تھا۔ جن کا بہت کچھ ادب اور پاس و لحاظ کیا جاتا اور ماہوار تنخواہ کے علاوہ روزانہ انعام و اکرام سے سرفراز ہوتے رہتے۔ آصف الدولہ کے زمانے سے جب لکھنؤ کمالوں کی قدردانی کا مرکز قرار پایا تو دہلی کے بہت سے خاندانی اطبا نے یہیں توطن اختیار کر لیا اور چند روز کے بعد زبان اور شاعری کی طرح فن بھی خاص یہیں کا فن بن گیا۔ چنانچہ لکھنؤ نے حکیم مسیح الدولہ۔ حکیم شفاء الدولہ۔ حکیم مرزا محمد علی۔ حکیم سید محمد مرتعش۔ حکیم مرزا کوچک۔ حکیم بناؔ۔ حکیم مرزا محمد جعفر کے ایسے عالی پایہ و گران قدر طبیب پیدا کئے جو سچ یہ ہے کہ اپنے فنون کے مجتہد تھے۔ اور سلف کے سارے سرمایۂ علمی پر ان کی نظریں تھیں۔ ہوتے ہوتے فن طب کو یہاں تک ترقی ہوئی کہ لکھنؤ کا شاذ و نادر ہی کوئی محلہ ہوگا جس میں کوئی نامور خاندان اطبا نہ موجود ہو۔ خاص شہر کے صدہا محلوں کے علاوہ گرد و نواح کے گاؤں اور قصبوں میں بھی ہزاروں مطب جاری تھے اور ہندوستان کے جن درباروں اور شہروں میں مشہور و نامور طبیب تھے سب لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ کے تھے چنانچہ قصبہ موہان کے ایک طبیب کو دربار گیکواڑ بڑودہ میں وہ عزت حاصل ہوئی جو بہت کم اطبا کو حاصل ہو سکی۔ غرض ایسے نامور طبیب خاک لکھنؤ نے پیدا کئے جن کی مسیحا نفسی کے کارنامے آج تک بچے بچے کی زبان پر ہیں۔

دربار اودھ کے آخر عہد میں سید محمد مرتعش کے ایک شاگرد رشید حکیم محمد یعقوب نے اپنا مطب جاری کر کے ایسی مرجعیت عامہ حاصل کی کہ ان کی ذات سے ایک بہت بڑے نامور طبی خاندان کی بنیاد پڑ گئی۔ جو آج بلا مبالغہ دنیا بھر میں جواب نہیں رکھتا۔ اسی خاندان کے مرحوم ناموروں میں حکیم محمد ابراہیم حکیم حافظ محمد عبدالعلی۔ حکیم محمد اسماعیل۔ حکیم محمد مسیح۔ حکیم محمد عبدالعزیز۔ حکیم حافظ محمد عبدالولی تھے اور حکیم عبدالحفیظ صاحب۔ حکیم عبدالرشید صاحب اور حکیم عبدالمجید صاحب اس وقت اپنی مسیحائی کے کمالات دکھا رہے ہیں۔ کاش یہ اپنے خاندانی فن کو چھوڑ کے دوسری ہوسوں میں نہ پڑتے۔

دہلی میں حکیم محمد شریف خان کا خاندان اس وقت تک موجود ہے جس میں حکیم محمود خان اور حکیم عبدالمجید خان ایسے باکمال گزر چکے۔ اور حاذق الملک حکیم محمد اجمل خان صاحب بزرگوں کے نام کو اپنے ذاتی کمالات سے آج تک ظاہر کر رہے ہیں دہلی میں حکیم محمد اجمل خان صاحب نے ایک مدرسۂ طبیہ بھی جاری کر دیا ہے اور طبی ویدک کانفرنس قائم کر کے اپنے فن کو بہت عروج دے رہے ہیں۔ ان کے مقابل لکھنؤ میں حکیم عبدالعزیز صاحب نے مدرسۂ تکمیل الطب قائم کیا۔ جس سے ہر سال بیسیوں اطبا تیار ہو کے اقطارِ ارض میں پھیلتے اور لکھنؤ کی طبی مرجعیت کا ثبوت دیتے ہیں۔

بہر تقدیر مسلمانوں کا برائے نام یونانی فنِ طب آج دنیا بھر میں کہیں زندہ ہے۔ تو ہندوستان میں۔ اور ہندوستان میں اس کے مرکز دہی شہر ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ مگر دہلی میں صرف ایک حکیم محمود خان کا خاندان ہے۔ اور لکھنؤ میں ایسے بیسیوں خاندان پڑے ہیں۔ دہلی میں بعض اور اطبا بھی مطب کرتے نظر آتے ہیں مگر وہ اسی زمانے کے جدید طبیب ہیں جنہوں نے اپنے مطب جما لئے ہیں۔ لکھنؤ میں گو کہ بہت سے نئے طبیب ہیں لیکن ایسے بہت سے خاندان بھی ہیں جن میں صدیوں سے فنِ طب کو ترقی رہی۔

لکھنؤ اور دہلی کے اطبا میں ایک اور فرق بھی ہے۔ طب کا موجودہ نصاب تعلیم ہمیں نہیں معلوم اطبائے دہلی کا مرتب کیا ہوا ہے یا اطبائے لکھنؤ کا۔ لیکن اس پر پورا پورا عمل جیسا اطبائے لکھنؤ نے کیا اطبائے دہلی نہیں کرتے۔ پڑھائی وہاں بھی یہی کتابیں جاتی ہیں مگر دہلی میں طبیبوں کا مطب ایک بڑی حد تک ان کی مروجہ طب سے الگ ہو جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ویدک کی دواؤں کو اختیار کر لینے میں اس قدر یقین کیا ہے کہ ان کے داخل کرنے میں اپنے قدیم مروجہ اصول خصوصاً مزاج کے مباحث سے چشم پوشی کر لی اور ان اجزا کو استعمال کرا دیتے ہیں جن کے مزاج اور افعال و خواص سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔

لکھنؤ میں عربی علوم

علوم عربیہ کے بڑے بڑے علما لکھنؤ کی خاک سے پیدا ہوئے۔ ہندوستان میں درباری زبان فارسی تھی ملازمت حاصل کرنے اور مہذب و معزز محفلوں میں چمکنے کے لئے یہاں فارسی کی تعلیم بخوبی

کافی خیال کی جاتی تھی۔ اودھ ہی نہیں سارے ہندوستان میں ادبی اور اخلاقی ترقی کا ذریعہ صرف فارسی قرار پائی تھی۔ مسلمان تو مسلمان اعلیٰ طبقے کے ہندوؤں کا عام رجحان فارسی ادب و انشا کی طرف تھا۔ یہاں تک کہ اعلیٰ درجے کی انشا ہندو مصنفوں ہی کے قلم سے مرتب و مدون ہوئی تھیں۔ ٹیک چند بہارؔ نے بہار عجم کی سی لاجواب کتاب تصنیف کر دی۔ جس میں ہر محاورے کی سند میں اہل زبان کے بے شمار فارسی اشعار پیش کر دیئے گئے۔ لکھنؤ کے ابتدائی عروج میں مُلا فائق کا اور پھر مرزا قتیل کا نام مشہور ہوا جو ایک نومسلم فارسی داں تھے۔ وہ خود تو مذاقاً کہا کرتے کہ۔

"بوئے کباب مرا مسلمان کرد"

مگر سچ یہ ہے کہ فارسی کی تعلیم۔ اس کے شوق اور کمال فارسی دانی کی آرزو نے انہیں مسلمان ہونے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے محض اسی شوق میں ایران کا سفر کیا۔ برسوں شیراز و اصفہان اور طہران و آذربائیجان کی خاک چھانی اور ادبِ فارسی کے اس اعلیٰ کمال کو پہنچ گئے کہ خود اہل زبان بھی ایسے باکمال زباندان پر حسد کریں تو تعجب کی بات نہیں ہے۔

مرزا غالب نے جا بجا مرزا قتیل پر حملے کئے ہیں۔ بے شک مرزا غالب کا مذاق فارسی نہایت اعلیٰ درجے کا تھا۔ وہ اس اصول پر بار بار زور دیتے تھے کہ سوا اہل زبان کے کسی کا کلام سند نہیں ہو سکتا۔ مگر ان کے زمانے میں چونکہ اودھ سے بنگالے تک لوگ قتیل کے پیرو تھے اور بات بات پر قتیل کا نام لیا جاتا تھا اس لئے مرزا غالب کو اکثر طیش آ گیا اور جب پیروانِ قتیل نے ان کی خبر لینی شروع کی تو کہنے لگے۔

فیضے از صحبتِ قتیلم نیست ؎ رشک بر شہرتِ قتیلم نیست
مگر آنانکہ فارسی دانند ؎ ہم بریں عہد و رائے پیمانند
کہ ز اہل زبان نبود قتیل ؎ ہرگز از اصفہان نہ بود قتیل

مگر اس سے یہ نہیں نکلتا کہ قتیل نے فارسی دانی میں جو کوششیں کی تھیں اور اس میں واقفیت و کمال حاصل کرنے میں جو زندگی صرف کی تھی وہ بالکل بے کار گئی۔ اس بات کے ماننے میں کسی کو عذر نہیں ہو سکتا کہ قتیل کا کوئی دعویٰ جب تک وہ اہل زبان کی سند نہ پیش کریں قابل تسلیم نہیں ہے اور نہ خود قتیل کے ذہن میں کبھی یہ خیال گزرا ہو گا لیکن اس کی خصوصیت قتیل ہی کے ساتھ نہیں۔ ہندوستان کا کوئی شخص بجائے خود سند نہیں ہو سکتا۔ خود مرزا نوشہ غالب بھی کوئی فارسی کا محاورہ بغیر اہل عجم کے بغیر ثبوت کے پیش کئے نہیں استعمال کر سکتے۔ ہندوستانی فارسی دانوں کا اگر کچھ وقار قائم ہو سکتا ہے تو صرف اس بنا پر کہ کلام فارسی میں ان کی نظر وسیع ہے اور ہر ہر لفظ کے صحیح محل استعمال سے واقف ہیں۔ اور اس حیثیت سے سچ پوچھئے تو غالب کے مقابلے میں قتیل کا پایہ بہت بلند تھا۔ غالب زندگی بھر ہندوستان کی خاک چھانتے رہے اور اس کے ساتھ طلبِ معاش میں سرگرداں رہے۔ قتیل کو اطمینان کا زمانہ ملا تھا اور مدتوں ایران میں رہ کر گاؤں گاؤں کی ٹھوکریں کھاتے پھرے تھے۔

لکھنؤ میں فارسی دانی

لکھنؤ کی فارسی دانی کا آغاز قتیل سے ہوا۔ اور ان سے کچھ پہلے مُلا فائق نے جن کا خاندان آگرے سے آ کر مضافات لکھنؤ میں بس گیا تھا ادب و انشا سے فارسی اور فارسی نظم و نثر میں اعلیٰ درجے کی بے نظیر کتابیں تصنیف کیں۔ فارسی گو اور فارسی داں ہندوستان میں اس سے پہلے بھی گزرے تھے۔ مگر فارسی دانی کے ساتھ زبان فارسی کے اصول و ضوابط اور اس کی صرف و نحو کے مدون کرنے کا شوق پہلے پہل لکھنؤ میں ہی شروع ہوا اور وہ انہیں کی قلم سے ظاہر ہوا۔ ان کی کتابیں اگر سچ پوچھئے تو بے مثال و لاجواب ہیں۔

اس کے بعد فارسی یہاں کی عام تعلیم میں داخل رہی۔ اور نصاب فارسی ایسا بلیغ و دقیق رکھا گیا۔ جو سچ یہ ہے کہ خود ایران کے نصاب سے سخت تھا۔ ایران میں جیسا کہ ہر ملک کے لوگوں کا معمول ہے سیدھی سادی فصیح زبان جس میں صفائی کے ساتھ خیال آفرینی کی جائے۔ پسند کی جاتی ہے۔ اور اسی قسم کا نصاب ابھی ہے ہندوستان میں عرفی و فیضی اور ظہوری و نعمت خان عالی کے ایسے نازک خیال شعرا کا کلام داخل درس کیا گیا۔ مُلا طغرا اور مصنف پنج رقعہ کے ایسے دقت پسندوں کا کلام پڑھا اور پڑھایا جانے لگا۔ جس سے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی زبان دانی اس آخر عہد میں خود ایران سے بڑھ گئی تھی۔ اور یہیں کے لوگوں نے فارسی کی تمام درسی کتابوں پر اعلیٰ درجے کی شرحیں لکھ ڈالی تھیں۔

اور اسی کا یہ حیرت انگیز نتیجہ ہے کہ جب دنیا کی تمام زبانوں کے شعرا اہل زبان ہی کے حلقے میں محدود رہتے ہیں۔ اور غیر اہل زبان میں اگر دو چار شاعر پیدا بھی ہو جاتے ہیں تو اہل زبان میں ان کا اعتبار نہیں ہوتا۔ فارسی کے شعرا ایران سے زیادہ نہیں۔ تو ایران کے برابر ہی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ خصوصاً گذشتہ صدی میں جبکہ ترقی و تعلیم کی دنیا میں لکھنؤ کا ڈنکا بج رہا تھا۔ یہاں کا بچہ بچہ فارسی گو تھا۔ جاہل رنڈیوں اور بازاری مزدوروں کی زبان پر فارسی کی غزلیں تھیں اور بھانڈ تک فارسی کی نقلیں کرتے تھے۔ تعلقات اودھ کے تمام شعرا کا مہذب مشغلہ اور ذریعہ معاش فارسی پڑھانا تھا اور ایسے اعلیٰ درجے کے دیہاتی فارسی مدرس لکھنؤ کی گلیوں میں مارے مارے پھرتے تھے کہ ان کی زبان دانی پر خود اہل عجم بھی عش عش کر جاتے۔ ان کا لب و لہجہ اہل زبان کا سا نہ ہو۔ مگر فارسی کے محاوروں اور بندشوں اور الفاظ کی تحقیق و تدقیق میں ان کو وہ درجہ حاصل تھا کہ معمولی اہل زبان کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔

لکھنؤ میں فارسی کا مذاق جس قدر بڑھا ہوا تھا۔ اس کا اندازہ لکھنؤ کی اردو زبان سے ہو سکتا ہے۔ جہلا اور عورتوں تک کی زبان پر فارسی کی ترکیبیں بندشیں اور اضافتیں موجود تھیں اور لکھنؤ کی زبان پر حملہ کرنے والوں کو اگر کوئی اعتراض اتنے دنوں میں مل سکا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ اس میں فارسی اعتدال سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ لیکن اس دور کے معیار ترقی کے لحاظ سے یہی چیز لکھنؤ کی زبان کی خوبی اور اس کی معاشرت کے زیادہ بلند ہو جانے کی دلیل تھی۔ خود دہلی میں زبان اردو کی ترقی کے جتنے دَور قائم کئے جائیں ان میں بھی اگلے پچھلے دَور کا امتیاز صرف یہی ہو سکتا ہو سکتا ہے کہ پہلے کی بہ نسبت بعد والے میں فارسی کا اثر زیادہ ہے۔

مسلمانوں کی طرح ہندو بھی فارسی میں نمود حاصل کر رہے تھے۔ اگرچہ یہ امر دولت مغلیہ کے ابتدائی عہد سے ظاہر ہونے لگا تھا۔ مگر اس وقت بھی بعض نامور مستند فارسی داں اور فارسی گو موجود تھے۔ مگر اودھ میں یہ مذاق انتہائی کمال کو پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ جیسے باکمال فارسی داں ہندو سواد لکھنؤ میں موجود تھے کہیں نہ تھے کالستھوں اور کشمیری پنڈتوں نے تعلیم فارسی کو اپنے لئے لازمی قرار دے لیا تھا اور یہاں تک ترقی کی کہ کشمیری پنڈتوں کی تو مادری زبان ہی فارسی ہو گئی۔ اور ان کی اور مسلمانوں کی فارسی دانی میں بہت کم فرق تھا۔ کالستھ چونکہ یہیں کے متوطن تھے اس لئے ان کی زبان بھاشا رہی۔ مگر تعلیم فارسی کی کالستھوں کے رگ و پے میں اس

قدر سرایت کر گئی تھی کہ نہایت ہی بے اعتدالی اور بے ربطی کے ساتھ محاورات فارسی کو استعمال کرنے لگے۔ جو بات کہیں کے ہندوؤں میں نہ تھی۔ ان دنوں لوگ کائستھوں کی زبان کا مضحکہ اڑایا کرتے تھے۔ مگر سچ یہ ہے کہ بجائے مذاق اڑانے کے ان کی قدر کرنی چاہیئے تھی۔ اس لئے کہ ان کی زبان ان کی علمی ترقی کی دلیل تھی جس طرح آج کل انگریزی لفظوں کے جا و بے جا استعمال کو انگریزی دان اپنی علمی ترقی کا ثبوت خیال کرتے اور نہایت بدتمیزی سے انگریزی الفاظ اپنی زبان میں بھرتے چلے جاتے ہیں۔

لکھنؤ میں ان دنوں فارسی کے صدہا نثار اور شاعر موجود تھے اور اردو کی طرح برابر فارسی مشاعروں کا بھی سلسلہ جاری تھا۔ فارسی شرفا ہی نہیں عوام الناس تک کا شعار و شارہ بن گئی تھی اور اب باوجودیکہ فارسی درباری زبان نہیں باقی رہی اور حکومت کی مسند پر اردو زبان قابض و متصرف ہو گئی ہے۔ مگر مہذب سوسائٹی پر آج تک فارسی کا سکہ جما ہوا ہے اور عام خیال یہی ہے کہ فارسی مدارس و مکاتب سے نکل گئی۔ اور تحصیل معاش کے لئے اس کی ضرورت نہیں باقی رہی مگر انسان بغیر فارسی پڑھے مہذب سوسائٹی میں بیٹھنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ صحیح معنوں میں انسان کامل بن سکتا ہے۔

انگلستان میں فرانس کی زبان کبھی درباری زبان تھی۔ اب اگرچہ مدت ہوئی کہ وہ دربار سے نکال دی گئی۔ مگر معاشرت اور اخلاقی ترقی آج بھی وہاں بغیر فرانسیسی زبان کے سیکھے نہیں حاصل ہو سکتی کھانے پینے۔ اٹھنے بیٹھنے۔ پہننے اوڑھنے اور ہنسنے بولنے غرض زندگی کے تمام اسلوبوں پر فرانسیسی کی حکومت اب تک ویسی ہی موجود ہے۔ اور لڑکیاں بغیر فرنچ زبان حاصل کئے شائستہ بیبیاں نہیں بن سکتیں۔

یہی حال لکھنؤ کا ہے۔ کہ فارسی دربار سے گئی۔ خط و کتابت سے گئی۔ مگر معاشرت کے تمام شعبوں پر اب تک حکومت کر رہی ہے۔ اور بغیر فارسی کی تعلیم پائے نہ ہمارا مذاق درست ہو سکتا ہے اور نہ ہمیں بات کرنے کا سلیقہ آسکتا ہے۔

مٹیابرج (کلکتہ) میں آخری محروم القسمت تاجدار اودھ کے ساتھ جو چند لوگ وہاں سکونت پذیر ہو گئے تھے ان میں کوئی پڑھا لکھا نہ تھا۔ جو فارسی نہ جانتا ہو۔ دفتر کی زبان فارسی تھی اور ہندو مسلمانوں میں صدہا فارسی گو شاعر تھے۔ عورتیں تک فارسی میں شعر کہتی تھیں۔ اور بچہ بچہ فارسی زبان میں اپنا مطلب ادا کر لیتا تھا۔

موجودہ لکھنؤ میں اگرچہ فارسی کی تعلیم بہت کم ہو گئی ہے اور ہندوؤں نے تو اسے اس قدر چھوڑ دیا کہ وہ کائستھوں کی زبان ہی خواب و خیال ہو گئی جس کا زباں دانی کی صحبتوں میں مذاق اڑایا جاتا تھا۔ اور بھانڈ تک اس فارسی آمیز زبان کی نقلیں کرتے تھے۔ مگر پھر بھی پرانے بزرگوں اور خصوصاً مسلمانوں میں بہت کچھ فارسی کا موجود ہے۔ اس لکھنؤ کی اردو دانی ہی ایک حد تک ان کے لئے فارسی دانی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

مسلمانوں میں اب تک خواجہ عزیز الدین صاحب ایسا محقق فارسی اگلی بزم سخن کے یاد دلانے کو پڑا ہوا ہے جو اپنے کمال کے لحاظ سے سارے ہندوستان میں یکتا ہیں اور پرانے سن رسیدہ ہندوؤں میں بھی متعدد فارسی کے اسکالر ملیں گے جن کا ایک نمونہ سندیلہ کے راجہ درگا پرشاد صاحب ہیں جن کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ زمانہ بدل گیا۔ زمین و آسمان بدل گئے۔ آب و ہوا بدل گئی مگر وہ آج تک وہی ہیں۔ فارسی دانی کی داد دینے اور لینے کو موجود ہیں۔ اور اگلی تاریخ کے ایک کرم خوردہ ورق کی طرح چومنے چاٹنے اور آنکھوں سے لگانے کے قابل ہیں۔

لکھنؤ کا فن خطاطی

علوم ہی سے وابستہ کتابت اور تحریر کے فن ہیں۔ مسلمانوں کا پرانا خط عربی تھا جس کو نسخ کہتے ہیں۔ خلافت بغداد کے ازمنہ وسطیٰ تک ساری دنیائے اسلام میں مشرق سے مغرب تک یہی خط تھا۔ جو اپنی حیرہ کے پرانے خط سے خطِ کوفی اور خطِ کوفی سے خطِ نسخ بن گیا تھا۔ خاندان طاہریہ کے زمانے سے وہ تمام علوم و فنون جو بغداد میں عروج پا رہے تھے۔ ایران و خراسان کی طرف آنے لگے۔ اور دیلمیوں اور سلجوقیوں کے زمانے میں بغداد کے اثر کمالات ایران میں بخوبی جمع ہو گئے۔ خصوصاً دیلمیوں کے علمی ذوق اور تفنن طبع سے ایران کا مغربی صوبہ آذربائیجان جو قدرتاً عراق عجم و عراق عرب کے آغوش میں واقع تھا۔ ہر قسم کی خوبیوں اور ترقیوں کا گہوارہ قرار پا گیا۔ اسی علاقے میں پہلے پہل خط نے بھی نئی وضع اختیار کرنا شروع کی۔ کتابت خطاطی کی حدوں سے نکل کے نقاشی کی قلمرو میں داخل ہو گئی اور اس میں مصورانہ نزاکتیں پیدا کی جانے لگیں۔ عجمی نزاکت پسندوں کو خطِ عرب کی پرانی سادگی میں بھدا پن نظر آیا اور پرانی شان اور وضع خود بخود چھوٹنے لگی۔

نسخ میں قلم ہر حرف اور لفظ میں اول سے آخر تک یکساں رہا کرتا تھا۔ حرفوں میں غیر موزوں نمی اور غیر متناسب ناہمواری ہوتی تھی۔ دائرے گول نہ تھے بلکہ نیچے ہو چلے ہوتے اور ادھر ادھر ان میں کونے پیدا ہو جاتے۔ اب نقاشی کی نزاکت کو خطاطی میں ملا کے تحریر میں نوک پلک پیدا کی جانے لگی۔ حرفوں کی نوکیں۔ گردنیں اور دمیں باریک بنائی جانے لگیں۔ دائرے خوبصورت اور گول لکھے جانے لگے۔ اس جدید مذاق کو پوری طرح پیش نظر رکھ کے سب سے پہلے میر علی تبریزی نے جو خاص دیلم کا رہنے والا تھا۔ اس نئے خط کو با اصول و با قاعدہ بنا کے مشرقی بلاد میں رواج دیا اور اس کا نام نستعلیق قرار دیا۔ جو اصل میں نسخ تعلیق یعنی ضمیمۂ نسخ تھا۔

یہ نہیں معلوم کہ میر علی تبریزی کس زمانے میں تھے۔ منشی شمس الدین صاحب جو لکھنؤ کے مشہور و مستند خوش نویس تھے۔ ان کا زمانہ تیمور سے پہلے بتاتے ہیں۔ لیکن نستعلیق کی کتابیں اتنی پرانی ملتی ہیں کہ تیمور تو در کنار ہم سمجھتے ہیں کہ اس خط کی ایجاد محمود غزنوی سے بھی پہلے ہو چکی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ محمود کے حملوں کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان میں فارسی خوش نویسوں کی آمد بھی شروع ہو گئی ہوگی۔ جن کے اثر سے یہاں اس خط کا رواج شروع ہوا۔ اور ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر خطے میں نستعلیق کے خوش نویس کثرت سے پیدا ہو گئے۔ لہذا یا تو میر علی تبریزی کا زمانہ بہت قدیم ہے اور یا وہ اصلی موجد خط نہیں ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ دہلی و لکھنؤ بلکہ سارے ہندوستان کی موجودہ خوش نویسی اپنا استاد اول میر علی تبریزی کو بتاتی ہے۔ ان کے ایک مدت دراز کے بعد ایران میں نستعلیق کی استادی میں میر عماد الحسینی کا نام مشہور ہوا۔ جو خوش نویسوں میں بڑے ممتاز و نامور کاتب اور استاد اکمل مانے جاتے ہیں۔ ان کے بھانجے آغا عبدالرشید دیلمی نادر شاہ کے حملوں کے زمانے میں وارد ہند ہوئے اور لاہور میں آکے ٹھہر گئے۔ لاہور میں ان کے صدہا شاگرد ہوئے جنہوں نے اقطاع ہند میں پھیل کے انہیں ہندوستان کی خوش نویسی کا آدم نہیں تو نوح ضرور ثابت کر دیا۔

انہیں کے دو شاگرد جو ولائتی تھے۔ وارد لکھنؤ ہوئے۔ ان دونوں بزرگوں میں

سے ایک حافظ نوراللہ اور دوسرے قاضی نعمت اللہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ عبداللہ بیگ نام آغا عبدالرشید کے ایک تیسرے باکمال شاگرد بھی لکھنؤ میں آئے تھے ان حضرات کے آنے کا زمانہ غالباً نواب آصف الدولہ بہادر کا عہد تھا جب یہاں کوئی باکمال آکے واپس نہ جانے پاتا تھا۔ قاضی نعمت اللہ آتے ہی اس خدمت پر مامور ہوگئے۔ کہ شہزادوں کو اصلاح دیا کریں۔ اور حافظ نوراللہ کو بھی دربار اودھ سے تعلق ہوگیا اور ان دونوں نے یہاں شہر کے لوگوں کو خوش نویسی کی تعلیم دینا شروع کی۔

ان بزرگوں کے علاوہ یہاں اور پرانے خوش نویس بھی تھے جن میں سے ایک نامور بزرگ منشی محمد علی بتائے جاتے ہیں۔ مگر آغا عبدالرشید کے شاگردوں نے اپنا ایسا سکہ جمالیا کہ خوش نویسی کے تمام شائق بلکہ سارا شہر ان کی طرف رجوع ہوگیا۔ جسے خطاطی کا شوق ہوا انہیں کا شاگرد ہوگیا اور تمام خوش نویسان سلف کے نام مٹ کے گمنامی کے ناپید کنار سمندر میں غرق ہوگئے۔ اور سچ یہ ہے کہ یہ بزرگ اپنے کمال کے اعتبار سے اس کے مستحق بھی تھے۔

حافظ نوراللہ کی لکھنؤ میں جو قدر ہوئی۔ اس کا اندازہ اسی سے نہیں ہوسکتا کہ وہ یہاں سرکاری ملازم ہوگئے تھے۔ بلکہ لکھنؤ کی قدردانی کا صحیح اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ لوگ ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قطعوں کو موتیوں کے داموں مول لیتے۔ یہاں تک کہ ان کی معمولی مشق بازار میں حرف ایک روپیہ حرف کے حساب سے ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھی۔

ان دنوں اُمرا اور شوقین لوگ اپنے مکانوں کو بجائے تصویروں کے قطعات سے آراستہ کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے علی العموم قطعوں کی بے انتہا مانگ تھی اور جہاں کسی اچھے خوش نویس کے ہاتھ کا قطعہ مل جاتا اس پر لوگ پروانوں کی طرح گرتے اور اسے آنکھوں سے لگاتے۔ اس سے سوسائٹی کو تو یہ فائدہ پہنچتا کہ اکثر اخلاقی اصول اور ناصحانہ فقرے یا اشعار ہمیشہ پیش نظر رہتے اور ہر وقت گھر میں اخلاقی سبق ملتا رہتا۔ اور خوش نویسی کو یہ فائدہ پہنچتا کہ خوش نویسوں اور صاحب کمال خطاطوں نے اپنے کمال کو قطعہ نویسی ہی تک محدود کر دیا تھا۔ جو آبدار اور عمدہ وصلیوں کو لکھ کے تیار کرتے اور اسی میں وہ گھر بیٹھے دولت مند ہوجاتے۔ مگر افسوس اب ہندوستان سے قطعات اور کتبوں کا رواج اٹھتا جاتا ہے اور ان کی جگہ تصویروں نے لے لی ہے جس کی وجہ سے اگلے نفیس و مہذب شرعی مذاق آرائش کے مٹ جانے کے ساتھ خوش نویسی بھی ہندوستان سے اُٹھ گئی۔ اب کاتب ہیں خوش نویس نہیں ہیں اور جو دو ایک خطاط مشہور بھی ہیں وہ مجبور ہیں کہ کاپی نویسی اور کتابت سے اپنا پیٹ پالیں۔ جو چیز کہ اصل میں خوش نویسی کی دشمن ہے۔ برخلاف اس کے ان دنوں ایک گروہ قائم ہوگیا تھا جس کا کام فقط یہ تھا کہ خوش نویسی کو اپنے اصول پر قائم رکھے اور اس کو وقتاً فوقتاً مناسب ترقیاں دیتا رہے۔ چنانچہ اگلے خوش نویس کتابت کو اپنی شان سے ادنیٰ سمجھتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ جو شخص پوری پوری کتابیں لکھے گا۔ وہ غیر ممکن ہے کہ اول سے آخر تک اصول و قواعد خوش نویسی کو پوری طرح نباہ سکے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جتنی محنت اور مشقت وہ لوگ ایک وصلی کی درستی میں کرتے تھے۔ اس کا عشر عشیر محنت بھی کاتب کسی پوری کتاب کے لکھنے میں نہیں کر سکتے۔

ان کی محنت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حافظ نوراللہ سے ایک بار نواب سعادت علی خان نے فرمائش کی کہ مجھے گلستان کا ایک نسخہ لکھ دیجئے۔ نواب سعادت علی خان گلستان سعدی کے بے حد شائق تھے اور کہتے ہیں کہ گلستان ہر وقت ان کے سرہانے موجود رہا کرتی تھی اور کوئی ایسی فرمائش کرتا۔ تو حافظ نوراللہ اپنی توہین سمجھ کے اس کا منہ ہی نوچ لیتے۔ مگر فرمان روائے وقت کا کہنا تھا۔ منظور کر لیا اور عرض کیا۔ تو مجھے اسی گڈی کا کاغذ (ان دنوں رم کو گڈی کہتے تھے) ایک سو قلم تراش چاقو۔ اور خدا جانے کتنے ہزار قلموں کے نیزے منگوا دیجئے۔

سعادت علی خان نے حیرت سے پوچھا۔ فقط اکیلی ایک گلستان کے لئے اتنا سامان درکار ہوگا؟ کہا۔ جی ہاں۔ میں اتنا ہی سامان خرچ کیا کرتا ہوں۔ نواب کے لئے اس سامان کا فراہم کرنا کچھ دشوار تو تھا نہیں منگوا دیا۔ اب حافظ صاحب نے گلستان لکھنی شروع کی۔ مگر پوری نہیں ہونے پائی تھی۔ سات ہی باب لکھنے پائے تھے۔ اور آٹھواں باب باقی تھا کہ انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد جب ان کے بیٹے حافظ ابراہیم دربار میں پیش ہوئے اور انہیں سیاہ خلعت تقریب عطا ہوا۔ تو سعادت علی خان نے کہا۔ میں نے حافظ صاحب سے گلستان لکھوائی تھی۔ خدا جانے اس کا کیا حال ہوا؟ — حافظ ابراہیم نے عرض کیا۔ ان کے لکھے ہوئے سات باب تیار ہیں۔ آٹھواں باب باقی ہے۔ اسے یہ حقیر لکھ دے گا۔ اور اس قدر ان کی شان سے ملا دے گا۔ کہ حضور امتیاز نہ کر سکیں گے۔ لیکن ہاں۔ اگر کسی معمر خوش نویس نے دیکھا۔ تو وہ بے شک پہچان لے گا۔ نواب نے اجازت دی اور اس گلستان کو حافظ ابراہیم نے پورا کیا۔

حافظ نوراللہ کے شاگردوں میں زیادہ ممتاز سب سے اول تو خود ان کے بیٹے حافظ ابراہیم تھے۔ دوسرے منشی سرب سکھ نام ایک ہندو بزرگ تھے جن کو کوئی کائستھ بتاتا ہے اور کوئی کشمیری پنڈت۔ اور تیسرے محمد عباس نام لکھنؤ کے ایک خوش نویس۔ حافظ ابراہیم نے بھی بہت نام پیدا کیا۔ سیکڑوں آدمیوں کو خوش نویس بنا دیا اور فن میں مجتہدانہ مرتبہ پیدا کر کے اپنے والد سے جدا ایک شان پیدا کی۔ حافظ نوراللہ کے دائرے بالکل گول ہوتے تھے حافظ ابراہیم نے ان میں ایک خفیف سی بیضاویت اختیار کی۔ منشی سرب سکھ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اپنے استاد کی طرز اس قدر اُڑا لی تھی کہ صدہا وصلیاں حافظ نوراللہ کے نام سے پھیلا دیں۔ اور بڑے بڑے خوش نویس بالکل تمیز نہیں کر سکتے تھے۔ اور یہ ان دنوں خوش نویسی کا بہت بڑا کمال تھا۔

حافظ ابراہیم کے ممتاز شاگردوں میں پہلے تو ان کے فرزند حافظ سعیدالدین تھے۔ ان کے علاوہ منشی نظیر حمید۔ منشی عبدالمجید جو سرکار شاہی میں احکام شاہی اور پرچہ و پیام۔ (یعنی مراسلت فی مابین دولت انگلشیہ و دولت اودھ) لکھنے پر مامور تھے۔ مگر حافظ ابراہیم کے دو شاگردوں نے بہت ہی فروغ پایا۔ جو اپنے زمانے میں سارے لکھنؤ کے استاد قرار پاگئے تھے۔ ایک تو منشی منسارام کشمیری پنڈت جو اپنے فن کے بہت بڑے کامل تھے اور دوسرے منشی محمد ہادی علی جو نستعلیق کے علاوہ نسخ اور طغرا نویسی میں بھی لکھنؤ میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے ادھر قاضی نعمت اللہ کے شاگرد ایک تو ان کے فرزند مولوی محمد اشرف تھے اور دوسرے مولوی تقی احمد۔

غرض نستعلیق کے یہی لوگ استاد تھے جن سے لکھنؤ میں خوش نویسی کمال کو پہنچی۔ پھر مطبع جاری ہونے کے بعد کتابت و کاپی نویسی کو فروغ ہوا۔ اور دراصل

یہ اسی خاندان کی برکت ہے کہ لکھنؤ میں ہزاروں مسلمان ہزاروں کا تسیتھ جزے نویستہ اور اشرف آباد کے محلے بھرے ہوئے ہیں۔ اور سیکڑوں کشمیری پنڈت خوش نویس ہو گئے۔ مگر افسوس کشمیری پنڈتوں نے انگریزی تعلیم کے شوق میں اور خوش نویسی کی کساد بازاری دیکھ کے اس فن کو مطلقاً چھوڑ دیا۔ اور اب جتنے اچھے لکھنے والے ہیں۔ سب مسلمان ہیں یا کائستھ۔

آخر زمانے میں سندیلہ کے ایک منشی عبد الحی بھی بڑے باکمال خوش نویس تھے جن کے شاگرد منشی امیر اللہ تسلیم ان کے بڑے بھائی منشی محمد عبد اللطیف اور منشی اشرف علی وغیرہ تھے۔ فی الحال نستعلیق میں منشی شمس الدین صاحب اور نسخ میں منشی حامد علی صاحب کو شہرت ہے اور یہ دونوں منشی ہادی علی صاحب کے شاگرد ہیں۔ ہندوستان میں خط نسخ جن باکمالوں کی جانب منسوب کیا جاتا ہے ان میں سب سے پہلے شخص یاقوت مستعصمی کے لقب سے مشہور ہیں۔ جو یاقوت اول کہلاتے ہیں۔ ہمیں اس نام کا کوئی باکمال کاتب مستعصم باللہ کے عہد میں نہیں نظر آتا۔ کیا عجب کہ اس سے مراد عماد کاتب جوینی الملقب بہ فخر الکتاب المتوفی ۵۸۴ھ ہو۔ جس کی کتاب "خریدہ" مشہور ہے۔ اور جو پہلے ارض شام میں سلطان اتابک نور الدین زنگی کا اور اس کے بعد مصر میں سلطان صلاح الدین ایوبی فاتح بیت المقدس کا کاتب تھا۔ اس لئے کہ نسخ کا سب سے بڑا خوش نویس وہی مانا جاتا ہے اس کے بعد سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں محمد عارف نام خط نسخ کے ایک بڑے باکمال پیدا ہوئے۔ جن کو یاقوت رقم ثانی کا خطاب دیا گیا۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ انہوں نے خط نسخ کی نئی شان ایجاد کی اور بہ مقابل سابق کے اسے زیادہ خوبصورت بنا دیا۔ یہاں تک کہ اساتذہ لکھنؤ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے کمال کا ساری دنیائے اسلام نے اعتراف کر لیا۔ میں اس کے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں یاقوت رقم ثانی کو ہندوستان میں چاہے جیسی فوقیت حاصل ہو گئی ہو۔ مگر ان ممالک میں جہاں کا قومی خط خط نسخ اور قومی مادری زبان زبانِ عرب ہے۔ لوگ یاقوت رقم کا نام بھی نہیں جانتے اور نہ ان کی شان کے پیرو ہیں۔

محمد عارف یاقوت رقم کے زمانے میں عبد الباقی نام ایک شخص تھے۔ جن کا پیشہ حدادی یعنی لوہاری تھا انہیں یاقوت رقم کی مرجعیت عامہ دیکھ کے شوق ہوا کہ خود بھی اس فن میں کمال پیدا کریں۔ اتفاقاً عبد اللہ طباخ نام نسخ کے ایک اور خوش نویس ان دنوں مشہور تھے۔ حداد جا کے ان کے شاگرد ہوئے اور ایسی محنت کی کہ استاد کامل مشہور ہو گئے۔ جب ان دونوں کا زمانہ گزر گیا تو یاقوت رقم کی جگہ ان کے بھتیجے قاضی عصمت اللہ نے لی اور حداد کی یادگار ان کے دو فرزند علی اکبر اور علی اصغر تسلیم کئے گئے۔ اس کے بعد ہندوستان میں بڑے بڑے خوش نویس پیدا ہوئے اور برابر نسخ کی کتابت ہندوستان میں ترقی کرتی رہی۔ آخر میں شاہ غلام علی صاحب کو شہرت ہوئی۔ جو نسخ کے باکمال خوش نویس تھے۔ اس کے بعد لکھنؤ میں ایک طرف مولوی ہادی علی صاحب کی شہرت ہوئی جن کا خاندان دہلی سے آیا تھا اور کالپی کے ایک خوش نویس میر اکبر علی کے وہ شاگرد تھے۔ مولوی ہادی علی صاحب کو طغرا نگاری میں بڑا کمال حاصل تھا۔ منشی ہادی علی کے ہم عصر نسخ کے ایک مشہور خوش نویس میر بندہ علی مرتعش تھے ان کے استاد نواب احمد علی نام ایک پرانے وقت کے رئیس اور نسخ کے باکمال استاد تھے۔ میر بندہ علی کے ہاتھ میں رعشہ تھا۔ مگر قلم جیسے ہی کاغذ پر لگتا معلوم ہوتا کہ لوہے کا ہاتھ ہے۔ کیا مجال جو قابو سے باہر ہو۔ ان کی نظر خط کے پہچاننے میں ایسا کمال رکھتی تھی کہ بڑے بڑے لوگ لوہا مان گئے۔

منشی حامد علی صاحب فرماتے ہیں۔ ایک موقع پر منشی ہادی علی۔ منشی محمد یحییٰ (یہ بھی نسخ کے بڑے استاد تھے جنہوں نے طبع ہونے کے لئے لکھنؤ میں پہلا قرآن لکھا) منشی عبد الحی سندیلوی اور میر بندہ علی مرتعش ایک صحبت میں جمع تھے۔ یہ نسخ کے تمام باکمالوں کی صحبت تھی۔ کسی نے ایک قطعۂ نسخ فروخت کے لئے لا کے پیش کیا گو اس میں کاتب کا نام نہیں لکھا تھا۔ مگر ان باکمالوں نے بالاتفاق پہچان لیا کہ خاص یاقوت کے ہاتھ کا ہے اور سب کو شوق ہوا کہ اسے اپنے قبضے میں کریں مگر منشی ہادی علی صاحب نے کہا۔ یہ ایک دن میرے پاس رہے تو مجھے غور کرنے کے بعد اطمینان ہوگا کہ در اصل یہ یاقوت کے ہاتھ کا ہے یا نہیں۔ مالک نے دے دیا اور وہ اسے گھر لائے۔ دوسرے دن لے جا کے پیش کیا۔ اور کہا۔ واقعی یہ یاقوت کے ہاتھ کا ہی ہے۔ اسی کے ساتھ کا ایک قطعہ یاقوت کا میرے پاس بھی پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے لے جا کے اس سے ملایا تو بعینہٖ وہی پایا۔ اور مجھے یقین آ گیا۔ کہ یہ واقعی یاقوت کا ہے۔ اور دونوں قطعے سب کے سامنے رکھ دیئے۔ سب نے بلا تامل تسلیم کر لیا کہ دونوں یاقوت کے ہاتھ ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ مگر میر بندہ علی نے منشی ہادی علی والے قطعے کو غور سے دیکھا۔ پھر مسکرائے۔ اور اس کے نیچے لکھ دیا۔ "این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"۔ یہ تحریر دیکھ کر منشی عبد الحی صاحب بگڑے اور کہا۔ کیا آپ کو اس میں کچھ شک ؟ میر بندہ علی نے کہا۔ یہ قطعہ تو یاقوت کے ہاتھ کا نہیں ہو سکتا۔ منشی عبد الحی اور دیگر حریفانِ صحبت نے دعویٰ کیا کہ یہ خاص یاقوت کے ہاتھ کا ہے۔ میر بندہ علی نے اس میں ایک واؤ کا سر دکھایا اور کہا۔ یہ یاقوت کا نہیں ہو سکتا۔ اب سب لوگ گو مگو میں پڑے ہوئے تھے کہ منشی ہادی علی نے اس وصلی کا ایک کونا پھاڑ کے کاغذ کی تہہ کے اندر سے نکال کے اپنا نام دکھا دیا۔ اور سب کو یقین آ گیا کہ یہ کارستانی منشی ہادی علی صاحب کی تھی۔ سب نے ان کی بے حد تعریف کی۔ اور انہوں نے کہا۔ مگر میں تو میر بندہ علی صاحب کی نظر کا قائل ہو گیا۔

خوش نویسوں کے عام مذاق کے مطابق میر بندہ علی صاحب سے بھی قطعہ نویسی کے سوا کتابت غیر ممکن تھی۔ زندگی بھر کبھی کوئی چھوٹی کتاب بھی نہ لکھی گئی حاجی حرمین شریفین نے جب مطبع جاری کیا۔ تو ہزار منت و سماجت میر بندہ علی کو اس پر راضی کیا کہ انہیں ایک پنج سورہ لکھ دیں۔ میر بندہ علی نے بڑی محنت سے اور خدا جانے کتنے دنوں میں لکھا۔ اور لے گئے مگر حاجی صاحب کے سامنے جب اس پر آخری نظر ڈالی تو کچھ ایسا ناپسند ہوا۔ کہ بجائے حاجی صاحب کے حوالے کرنے کے پھاڑ ڈالا۔ اور کہا۔ بھئی مجھ سے نہیں ہو سکتا۔

ان بزرگوں کے تذکرے سے میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ خوش نویسی میں لکھنؤ کو کوئی ایسا امتیاز حاصل ہو گیا تھا جو ہندوستان میں عدیم النظیر ہو۔ بخلاف اس کے میرا خیال ہے۔ کہ نسخ کے جیسے جیسے باکمال دولت مغلیہ سے پہلے ہندوستان میں گزر چکے ہیں ان کے عشر عشیر درجے کو بھی یہ لوگ نہیں پا سکتے بلکہ نسخ کا کمال ان دنوں مٹ چکا تھا۔ نستعلیق کے متعلق اس قدر البتہ کہا جا سکتا ہے کہ حافظ نور اللہ اور حافظ ابراہیم کے ہاتھ کے قطعات جس ذوق و شوق سے سارے ہندوستان میں مقبول ہوئے اور کسی خوش نویس کے شاید

نہ ہو سکے ہوں گے۔ لیکن اس پر بھی خطاطی کے فن میں لکھنؤ کا درجہ قریب قریب وہی تھا جو دیگر متمدن شہروں کا ہو سکتا ہے۔

لکھنؤ کی طباعت

مگر لکھنؤ کی خوش نویسی نے مطبع کی ترقی میں جو کام کیا۔ شاید کہیں کی خوش نویسی نہ کر سکی ہوگی۔ مجھے اس کی تحقیق نہیں ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے مطبع کہاں سے جاری ہوا۔ کلکتے میں اردو لٹریچر کی ترقی اور نیز عام مشرقی علوم کی تقویت میں بہت کچھ اہتمام کیا گیا۔ مگر وہاں ٹائپ کے سوا پتھر کے چھاپے کی پرانی کتابیں میں نے نہیں دیکھیں۔ لکھنؤ میں یہ عہد غازی الدین حیدر ۱۲۳۴ھ محمدی تا ۱۲۵۶ھ محمدی مطابق ۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۷ء ارسل نام ایک یوروپین نے آکے لوگوں کو مطبع کا خیال دلایا۔ اور جب اہل علم مشتاق ہوتے تو اس نے پہلا مطبع لکھنؤ میں کھولا۔ اس نے پریس اور تمام سامان یہیں تیار کرا کے چھاپنا شروع کیا۔ اور زاد المعاد۔ ہفت قلزم اور تاج اللغات (جو بہت سی جلدوں میں تھی۔) چھاپ کے پبلک کے سامنے پیش کیں۔ اس سے سیکھ کے اور لوگوں نے بھی مطبع جاری کرنا شروع کئے۔ جن میں سب سے پہلا مطبع غالباً حاجی حرمین شریفین کا تھا۔ انہیں دنوں مصطفےٰ خان شیشہ آلات کے ایک دولتمند تاجر کچھ چھاپنے کے لئے حاجی حرمین کے پاس لے گئے اور حاجی صاحب کی زبان سے کوئی ایسا سخت کلمہ نکل گیا۔ کہ مصطفےٰ خان نے گھر آکے خود اپنا مصطفائی مطبع جاری کر دیا۔ جسے غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ تھوڑے دنوں بعد علی بخش خان نے علوی مطبع جاری کیا اور لکھنؤ میں کثرت سے چھاپے خانے کھلنے لگے۔

ابتداً طبع کا کام یہاں تاجرانہ اصول پر نہیں بلکہ شوقینی کی شان سے جاری ہوا۔ عمدہ سے عمدہ اوولی کاغذ لگایا جاتا۔ جو پتھر کے چھاپے کے لئے نہایت ہی موزوں تھا۔ بڑے بڑے خوش نویسوں کو مجبور کر کے اور بڑی بڑی تنخواہیں دے کے ان سے کتابت کا کام لیا جاتا۔ اور بغیر اس کے کہ کارگزاری کی کچھ بھی شرط ہو۔ یا اس کا ذرہ بھی خیال کیا جاتا ہو۔ کہ وہ دن بھر میں کتنا لکھتے ہیں یا لکھتے بھی ہیں یا نہیں ان کی خاطر داشت کی جاتی۔ اسی طرح پریس مینوں سے بھی نہ پوچھا جاتا کہ دن بھر میں کتنے کاغذ چھاپے۔ روشنائی کے لئے کڑوے تیل کے ہزاروں چراغ روشن کر کے اول درجے کا کاجل تیار کیا جاتا۔ کھٹائی کے عوض لیموں کا عرق صرف ہوتے اور کپڑے کی جگہ اصلی اسفنج کام میں لایا جاتا۔ غرض ہر چیز اول درجے کی کام میں لائی جاتی۔ اس اہتمام کا نتیجہ یہ تھا کہ شاہی کے زمانے میں فارسی و عربی کی درسی و دینی کتابیں جیسی لکھنؤ میں چھپ کے تیار ہوئیں۔ اہلِ بصیرت کے نزدیک کہیں نہ چھپ سکی ہوں گی۔ اس وقت کی چھپی ہوئی کتابیں جس کسی کے پاس موجود ہیں۔ ایک دولت ہیں۔ اور لوگ ڈھونڈتے ہیں اور نہیں پاتے۔

میرے والد کے حقیقی چچا مولوی احمد صاحب کو سفر اور تجارت کا بڑا شوق تھا اور اس زمانے میں جبکہ لوگ گھر سے باہر قدم نکالتے ڈرتے تھے۔ انہوں نے حاجی حرمین شریف کے ایجنٹ کی حیثیت سے رتھوں اور بیل گاڑیوں میں سوار ہو کے اور ہزاروں کتابیں ساتھ لے کے لکھنؤ سے راولپنڈی تک سفر کیا تھا۔ ان کا بیان تھا کہ کتابیں ان دنوں عنقا تھیں۔ یہاں کی مطبوعہ کتابوں کو دیکھ کے لوگوں کی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ اور پروانہ وار گرتے تھے۔ لوگوں کے شوق کا یہ عالم تھا کہ ہم جس شہر یا گاؤں میں پہنچتے۔ ہم سے پہلے ہماری خبر پہنچ چکتی اور ہمارا داخلہ عجب شان و شوکت سے ہوتا۔ ادھر ہم کسی بستی میں پہنچے۔ ادھر خلقت نے گھیر لیا۔ بھیڑ لگ جاتی تھی اور ہم جس کتاب کو جس قیمت پر دیتے لوگ بے عذر لے کر آنکھوں سے لگاتے۔ ہم کریما۔ مامقیماں وغیرہ کو فی جلد چھ آنے یا آٹھ آنے کے حساب سے اور گلستان اور بوستان کو فی جلد تین روپیہ یا چار روپیہ کے نرخ سے بیچتے۔ اور اس پر یہ حال تھا کہ ہم مانگ کو پورا نہ کر سکتے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک پہنچتے پہنچتے کتابوں کا ذخیرہ ختم ہو جاتا۔ اور نئے مال کے انتظار میں مہینوں ٹھہر جانا پڑتا ان دنوں مال کا پہنچنا دشوار تھا مگر ہم نے ایسا انتظام کر لیا تھا۔ کہ مال برابر لکھنؤ سے آتا رہتا۔

شاہی کے آخر دور میں مصطفائی مطبع اپنی چھپائی کے لحاظ سے دنیا میں جواب نہ رکھتا تھا۔ انتزاعِ سلطنت کے بعد منشی نول کشور نے اپنا مطبع جاری کیا۔ گو وہ چھپائی کی خوبی میں مصطفائی مطبع کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ مگر تجارت کے اصول پہ چل کے اس نے فارسی و عربی کی اتنی بڑی بڑی ضخیم کتابیں چھاپ دیں کہ آج کسی مطبع کو ان کے طبع کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ سچ یہ ہے کہ لکھنؤ میں اگلی شوقینی نے پریس کا ایسا مکمل سامان جمع کر رکھا تھا کہ اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے منشی نول کشور ہی کے ایسے بلند حوصلہ صاحب مطبع کی ضرورت تھی۔ آخر نول کشور پریس نے یہاں تک عروج پایا کہ سارے مشرقی لٹریچر کو اس نے زندہ کر دیا اور باعتبار وسعت طبع کے جو فوقیت لکھنؤ کو حاصل ہو گئی اور کسی شہر کو نصیب نہیں ہو سکتی اور اسی کی برکت تھی کہ وسط ایشیا میں کاشغر و بخارا تک اور افغانستان و ایران کی ساری علمی مانگ لکھنؤ ہی پوری کر رہا تھا۔ چنانچہ آج تک نول کشور پریس علمی تجارت کی کنجی ہے۔ جس سے کام لئے بغیر کوئی شخص علمی دنیا میں قدم نہیں رکھ سکتا۔

مگر افسوس اب لکھنؤ میں باوجود کثرت مطابع کے چھپائی کی حالت ایسی خراب ہو رہی ہے۔ اور روز بروز ابتر ہوتی جا رہی ہے اور دوسرے شہر اس پر فوقیت لے گئے ہیں۔ اور ہماری نظر میں پریس مینوں کی اخلاقی حالت خراب ہونے کی وجہ سے اب لکھنؤ میں اکثر شہروں کے مقابلے میں خراب چھپتا ہے۔ مگر ہمارے اطمینان کے لئے اتنا کافی ہے کہ کانپور میں منشی رحمت اللہ صاحب کی وجہ سے مطابع کی حالت اچھی ہے اور کانپور دراصل لکھنؤ ہی ترقیوں کا ایک ضمیمہ ہے۔

مطبع ہی کے ساتھ لکھنؤ میں مصلح سنگی کا فن ایجاد ہوا۔ پتھر پر جو کاپی جمائی جائے اسے کسی حد تک چھیل کے اور قلم لگا کے درست کرنا غالباً یورپ ہی سے شروع ہوا ہوگا اور وہاں اب بھی کیا عجب کہ اصلاح کا یہ عمل جاری ہو۔ مگر نسخ و نستعلیق کے حرفوں کو اس وضع سے درست کرنا کہ خوش نویس کی پوری شان باقی رہے اور کسی کو محسوس نہ ہو سکے کہ اس میں کسی اور کا بھی قلم لگا ہے خاص لکھنؤ کی ایجاد ہے۔ جہاں ابتداً یہ فن تو اسی حد پر محدود تھا۔ کہ حروف اور نقش و نگار جا بجا جس قدر اُڑ گئے یا کچل کے پھیل گئے ہوں ان کو درست کر دیا جائے۔ مگر چند روز کے بعد یہاں کی جدت پسندی اس حد سے آگے بڑھی اور ایسے باکمال مصلح سنگ پیدا ہونے لگے جو پتھر پر پوری پوری کتابیں اُلٹی لکھ دیتے ہیں۔ اور خط اپنی حدود پر اس قدر مکمل رہتا ہے کہ کیا مجال جو کوئی پہچان سکے کہ یہ پتھر پر اُلٹا لکھا گیا ہے۔ ابتداً اس کے صاحب کمال موجد ایک پرانے بزرگ تھے۔ جو مصطفائی

مطبع کی شہرت وناموری کے باعث ہوئے۔ ان کے زمانے ہی میں ان کے شاگردوں کی کثرت نے یہاں کے مطابع کو فائدہ پہنچایا۔ بہت سے لوگوں نے ترقی کی اور شہر سے مصلح سنگ بہم پہنچانے لگا۔

جب مصلح سنگی بہت عام ہو گئی تو منشی جعفر حسین نام ایک مشہور مصلح سنگ کو ان کی اعلیٰ مشاقی نے آمادہ کیا کہ مطبع کو کاپی نویسی سے بے پروا کر دیں۔ انہوں نے پتھر پر اُلٹا لکھنا شروع کیا۔ یہ کام ابتداً چھوٹے چھوٹے بازاری مطابع سے شروع ہوا۔ اور آخر میں اعلیٰ وادنیٰ سب مطبعوں میں ایک حد تک اختیار کر لیا گیا۔ اب منشی سید علی حسین صاحب نے اس حد تک ترقی کی کہ ان کے اُلٹے لکھے ہوئے خط کو بہت سے مشہور خوش نویس بھی نہیں پا سکے۔ چنانچہ ان کی اُلٹی کتابت کا ایک معمولی نمونہ ہمارا دل گداز بھی ہے جس کی کاپیاں نہیں لکھی جاتیں بلکہ منشی علی حسین صاحب مضامین کو پتھر پر اُلٹا لکھ دیا کرتے ہیں۔ ناظرینِ دل گداز کو پڑھ کے اور اس کے خط پر غور کر کے اندازہ فرما سکتے ہیں کہ مصلح سنگی کا فن لکھنؤ میں کس درجہ کمال کو پہنچ گیا ہے گو کہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں مصلح سنگ لکھنؤ ہی کے ہیں۔ لیکن اس وقت تک کسی اور شہر کے مطابع کو یہ بات نہیں نصیب ہوئی کاپیاں جمانے کے عوض عبارت پتھروں پر اُلٹی لکھوا کے چھاپیں۔ یہ فن آج تک لکھنؤ ہی تک محدود ہے۔ مگر افسوس پریس مینوں کی حالت خراب ہو جانے کے باعث لکھنؤ مصلح سنگی کے اس کمال سے اس قدر فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ جس قدر کہ ہونا چاہیئے۔

لکھنؤ کی طوائفیں

ناچنے کی استادی اگرچہ مردوں ہی میں مخصوص ہے مگر عام طور پر جس وسعت کے ساتھ طوائفوں نے اس فن کو ترقی دی وہ مردوں سے ممکن نہ تھی۔ ناچنے کو عورتوں کے ساتھ خصوصیت اور موزونیت بھی زیادہ ہے۔ یہ چیز ایک حد تک ہندوستان کے ہر شہر میں نظر آئے گی۔ مگر جیسی باکمال ناچنے والی رنڈیاں اور طوائفیں لکھنؤ میں پیدا ہوئیں شاید کسی شہر میں نہ ہوئی ہوں گی۔ لکھنؤ کی ایک مشہور طوائف گوہرؔ نے کلکتے میں جا کے نمود حاصل کی تھی۔ اس کا یہ عالم تھا کہ ایک محفل میں مکمل تین گھنٹے تک ایک ہی مصرعے کو ایسی خوبی سے گاتی رہی کہ حاضرینِ محفل محوِ حیرت تھے۔ زہرہؔ اور مشتریؔ صرف شاعرہ اور صاحب کمال گانے والیاں ہی نہیں بے نظیر رقاصہ بھی تھیں۔ جدنؔ نے ایک مدت تک لوگوں کو گرویدہ بنائے رکھا تھا۔

لکھنؤ کی رنڈیاں عموماً تین قوموں کی تھیں۔ اول کنچنیاں جو اصلی رنڈیاں تھیں اور ان کا پیشہ بالعموم عصمت فروشی تھا۔ یہ دہلی اور پنجاب سے شجاع الدولہ کے عہد میں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ شہر کی نامی طوائفیں اکثر اسی قوم کی تھیں۔ دوسری چونے والیاں۔ ان کا اصلی کام چونا بیچنا تھا مگر بعد کو بازاری عورتوں کے گروہ میں شامل ہو گئیں اور آخر میں انہوں نے بڑی شہرت حاصل کی۔ چونے والی حیدر جس کے گلے کا شہرہ تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ اس کا سا گلا کسی نے پایا ہی نہیں اسی قوم کی تھی اور اپنی برادری کی زنڈیوں کا بڑا گروہ رکھتی تھی۔ تیسری ناگرنیاں تھیں یہ تینوں وہ شاہدانِ بازاری ہیں جنہوں نے اپنے گروہ قائم کر لیئے تھے اور برادری رکھتی تھیں۔ ورنہ بہت سی اور قوموں کی عورتیں بھی آوارگی میں پڑنے کے بعد اسی گروہ میں شامل ہو جاتی ہیں۔

گویّوں اور ناچنے والوں کے بعد یہاں اس نوعیت کا ایک گروہ اور بھی ہے جس کی نشوونما لکھنؤ میں بہت ہوئی اور اسے لکھنؤ کے ساتھ مخصوص کیا جائے

تو شاید غلط نہ ہوگا۔ وہ رہس والے ہیں۔ رہس خاص متھرا اور برج کا فن ہے وہیں کے رہس دھاریوں نے آ آ کے لکھنؤ کو اس کا شوق دلایا۔ واجد علی شاہ کو جب رہس پسند آیا تو انہوں نے اپنے مذاق اور اپنے خیالی پلاٹ کا ایک نیا رہس تیار کیا۔ اس کو دیکھتے ہی رعایا میں اس بات کا خاص شوق پیدا ہوا کہ عاشقانہ قصے جوان دونوں پریوں کے حسن و عشق سے زیادہ وابستہ تھے عملی صورت میں دکھائے جائیں۔

پبلک کا یہ رجحان دیکھ کے میاں امانتؔ نے جو رعایت لفظی میں کمال رکھتے تھے اور باکمال شاعر تھے اپنی اندر سبھا تصنیف کی۔ جس میں ہندوؤں کی دیومالا میں مسلمانوں کے فارسی مذاق کی آمیزش کا پہلا نمونہ نظر آیا۔ یہ اندر سبھا جیسے ہی شہر میں دکھائی گئی ہر شخص اس کا گرویدہ ہو گیا۔ یکایک بیسیوں سبھائیں شہر میں قائم ہو گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا اس قدر رواج ہوا کہ گویّوں اور ناچنے والی رنڈیوں کا بازار چند روز کے لیئے سرد پڑ گیا۔ اب امانت کے سوا اور بہت سے لوگوں نے نئی سبھائیں بنانا شروع کیں۔ جن میں اردو شاعری چاہے بگڑتی ہو مگر زبان منجھتی اور پورب کی دیہاتی اور ہندو اہل حرفہ کی آبادی میں سرایت کرتی جاتی تھی۔ اس مذاق نے ڈراما اور تھیٹر کی مضبوط بنیاد ڈال دی تھی اور اگر چند روز اور شاہی کا دور رہتا تو بہت اچھے اصول پر خالص ہندوستانی ناٹک ایک خاص صورت پیدا کر لیتا جو بالکل نئی اور اچھوتی اور ہندوستانی شکل ہوتی۔

مگر یکایک مہذب سوسائٹی کو جس میں پرانی موسیقی گھر کر چکی تھی ان کھیلوں میں ابتذال نظر آیا۔ فن موسیقی کے شوق نے شرفا کو پھر گویّوں اور مجرا کرنے والے طائفوں کی طرف متوجہ کر دیا اور یہ چیزیں جو ناٹک کی شان رکھتی تھیں عوام الناس اور بازاری لوگوں ہی تک محدود رہ گئیں۔ مگر اگلے ذوق نے شہر میں اس مذاق کو عملی صورت میں دکھانے والا ایک خاص گروہ پیدا کر دیا جن کو آج کل کی اصطلاح میں اداکار کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ہمارے یہ اداکار پہلے تو مہذب سوسائٹی کی قدر دانی سے زبان اردو میں ترقی کرتے جاتے تھے مگر چونکہ ان کا شمار ادنیٰ درجے کے بازاری لوگوں میں رہ گیا۔ اس لیئے وہ مہذب زبان چھوٹ گئی اور بازاری زبان میں انہوں نے اداکاری دکھانی شروع کر دی۔

ہمارے ہاں تھیٹر کے اداکاروں کے فن کے مبتذل ہونے کا سب سے بڑا سبب یہ ہوا کہ بمبئی کے پارسیوں نے انگریزی مذاق کے تھیٹر کھڑے کیئے جن میں سچ یہ ہے کہ نہ فن موسیقی ہی تھا اور نہ صحیح ایکٹ۔ مگر ان کی صفائی ترتیب۔ طلسم نمائی اور ان کے زرق برق پردوں نے ہمارے ہندی ڈرامے کا جو ایک بچے کی طرح ابھی پالنے میں تھا گلا گھونٹ دیا۔ اعلیٰ سوسائٹی کے لوگ ناٹکوں کی ظاہری دلکشی پر فریفتہ ہو کر صحیح مذاق کو بھول گئے۔

سچ یہ ہے کہ بمبئی کے تھیٹروں نے ہندوستان کو بہ لحاظ فنون رقص و سرود کے اتنا فائدہ نہیں پہنچایا جتنا نقصان پہنچایا۔ سب سے پہلے موسیقی کا ذوق بگڑا اور ایسی وضع کے بے اصول لَغموں کو اختیار کر کے بازاروں میں پھیلا دیا جن سے زیادہ مہمل کوئی چیز نہیں ہو سکی۔ اس کے بعد اس نے قدیم ہندوستانی رقص کو جو بہت ہی اعلیٰ درجے کا فن تھا مٹانا چاہا اور اپنے سٹیج پر ناچ کے

نام سے یوروپ کی ڈرل کو رواج دیا۔ جس میں چند لڑکے اپنی ترتیب بدل کے دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔ لیکن رہس والوں کا موسیقی اور ایکٹ اگرچہ دونوں ناقص تھے مگر مقامی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اور رقص و موسیقی کا مذاق رکھتے تھے۔

لکھنوی سوز خوانی

اب سوز خوانی کے بیان کی ضرورت ہے اگرچہ اس نئے مذہبی فن کو موسیقی کے فن میں داخل کرنا بے ادبی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ سوز خوانی ایک خاص قسم کی پُرسوز اور درد میں ڈوبی ہوئی موسیقی ہے محرم میں شہادت سبط اصغر علیہ السلام کی یاد تازہ کرتا ہندوستان میں خاص شیعوں سے شروع ہوا خصوصاً اس وقت سے جب مذہب اثنا عشری ایران کا قومی مذہب بنا اور وہاں کے لوگ آآکے ہندوستانی دربار میں رسوخ حاصل کرنے لگے تاہم دہلی میں چونکہ تاجداروں اور شاہی خاندان کا مذہب سنت و جماعت تھا اس لئے وہ خاص چیزیں جو شیعوں کے مذہبی معاشرت کے ساتھ مخصوص تھیں وہاں نشوونما نہ پاسکیں۔ اس لئے ان فنون کی پرورش کا گہوارہ شہر لکھنؤ اور اس کا شیعہ دربار قرار پاگیا۔

جس طرح مذہبی سرگرمی نے شاعری میں مرثیہ گوئی اور تحت اللفظ خوانی کو پیدا کیا اسی طرح موسیقی میں سوز خوانی پیدا ہوئی پھر ان دونوں فنون کو یہاں تک ترقی دی کہ مستقل فن بن گئے اور ایسے فن جو ابتدا سے انتہا تک لکھنؤ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اصلی اور پرانی مرثیہ خوانی سوز خوانی ہی تھی۔ یعنی مرثیے مجلسوں میں ہمیشہ نغمے کے ساتھ سنائے جاتے تھے اور ان کا رواج دہلی ہی نہیں ہندوستان کے ان تمام شہروں میں تھا جن میں شیعہ حضرات آباد تھے۔ مدراس اور دکن تک میں زور شور سے اس طرح کی مرثیہ خوانی ہوتی تھی اور ڈیڑھ دو سو برس کے تصنیف کئے ہوئے نوحے آج تک موجود ہیں۔ مرثیہ کو شاعروں کی شعر خوانی کے لہجے میں ادا کرنا خاص لکھنؤ کی ایجاد ہے اور اس میں میر انیس اور مرزا دبیر وغیرہ نے جو کمالات دکھائے ان کا ذکر ہم اس سے پہلے پوری تفصیل سے کر چکے ہیں۔

لکھنؤ میں سوز خوان دیگر اہل فن کی طرح نواب شجاع الدولہ کے ساتھ یا ان کے عہد میں آئے۔ تاریخ فیض آباد میں لکھا ہے کہ شجاع الدولہ کی بیگم بہو بیگم صاحبہ کے محل میں مجلسیں ہوتی تھیں اور جواہر علی خان خواجہ سرا جو ان کی ڈیوڑھی اور سارے علاقے کا مختار تھا مرثیہ خوانوں کی نوحہ خوانی سنا کرتا۔ مگر اس وقت تک یہاں کی سوز خوانی وہی تھی جو ہر جگہ عام تھی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ خواجہ حسن مودودی سے یہ فن شروع ہوا۔ وہ مصنف نغمات الآصفیہ کے استاد تھے اور باوجود عطائی ہونے کے فن موسیقی میں ایسا کمال رکھتے تھے کہ دور دور تک کہیں ان کا جواب نہ تھا۔ اگرچہ سنی المذہب تھے مگر انہوں نے سوزوں کی خاص دردبھری اور پُروقار دھنیں بنائیں اور اس فن کے باضابطہ و باقاعدہ بننے کی بنیاد رکھ دی۔

اس کے بعد جب حیدری خان کا زمانہ آیا تو ان کا معمول تھا کہ محرم میں اپنے مذاق کی مناسب دھنوں میں نوحہ خوانی کیا کرتے۔ چونکہ بڑے صاحب کمال موسیقار تھے اور دریا دل قدر دان تھا۔ اس کوشش میں ان کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ انہوں نے موسیقی کی ہزارہا دھنوں میں سے وہ دھنیں منتخب کیں جو اظہار حزن و ملال اور بین کے لئے مناسب تھیں اور انہیں صدہا سوزوں میں قائم کیا گیا۔ آخر میں حیدری خان نے اپنی سوز خوانی سید میر علی صاحب کو سکھا دی جو ایک شریف النسل سید زادے تھے اور انہوں نے مذہبی عقیدت میں اس فن کو بہت زیادہ ترقی دی۔ وہ اپنے زمانے میں اتنے بڑے صاحب کمال ہوئے کہ نواب سعادت علی خان کے عہد میں انہوں نے کسی بات پر برہم ہوکے لکھنؤ سے چلے جانے کا ارادہ کیا تو انشاء اللہ خان انشا نے اپنے مؤثر شاعرانہ انداز کی شان سے سفارش کی اور نواب نے دل داری اور قدر دانی کے ساتھ انہیں روک لیا۔

ان کے بعد تان سین کے خاندان کا ایک گویا ناصر خان لکھنؤ آیا اور جب یہاں سوز خوانی کی طرف لوگوں کا رجحان دیکھا تو اس نے بھی اپنے موسیقی کے کمال کو نوحہ خوانی میں صرف کر کے مقبولیت و شہرت حاصل کی اور اپنے پڑوس کی ایک مفلس و بیوہ سیدانی پر ترس کھا کے ان کے دو بچوں میر علی حسن اور میر بندہ حسن کو سوز خوانی کی تعلیم دی۔ ان دونوں کا کمال تمام پہلے کے استادوں سے بڑھ گیا اور سوز خوانی میں بے نظیر ثابت ہوئے۔ انہوں نے سوز خوانی کو اعلیٰ درجے تک پہنچا دیا۔ انہی بزرگوں کی وجہ سے لکھنؤ میں سوز خوانی کا فن ایک باوقار اور باکمال درجہ حاصل کر گیا سوز خوانی میں بڑے بڑے نجیب الطرفین اور خاندانی لوگوں نے عروج پایا۔

منجھو صاحب اور دو ایک اور بزرگ اسی صدی کے آغاز تک ایسی شہرت اور ایسا کمال رکھتے تھے کہ ہندوستان بھر میں ان کے استقبال کو آنکھیں بچھائی جاتی تھیں سب سے زیادہ اثر اس ذوق نے لکھنؤ کی خواتین پر ڈالا۔ سوزوں کی مؤثر اور دل پر گہرا اثر کرنے والی دھنیں میر علی حسن اور میر بندہ حسن کے گلے سے نکلتے ہی صدہا شریف مردوں کے گلے میں اتریں اور ان کے ذریعہ ہزارہا شریف شیعہ خاندانوں کی عورتوں کے نور کے گلوں میں اتر گئیں۔ چنانچہ یہ حالت ہو گئی کہ محرم میں اور اکثر مذہبی عبادتوں کے ایام میں لکھنؤ کے گلی کوچوں میں تمام گھروں سے پُرسوز و گداز سوز خوانی کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

روشن چوکی

روشن چوکی بہت پرانا ساز تھا اور کل نہیں اس کے اہم ترین اجزا کو مسلمان اپنے ساتھ لائے کیونکہ شہنائی اس کا اہم جز ہے اور اس کی نسبت مشہور ہے کہ شیخ الرئیس ابن سینا کی ایجاد ہے۔ بالکل انسان کے گلے کی طرح جس قدر سچے سُر گلے بازی کے کمال کے ساتھ شہنائی سے ادا ہوتے ہیں اور کسی باجے سے نہیں ادا ہو سکتے۔ روشن چوکی میں کم از کم دو شہنائی نواز ہوتے ہیں اور ایک طبلچی جس کی کمر میں چھوٹے چھوٹے دو طبل بندھے ہوتے ہیں۔ طبل لَے کو قائم رکھتے ہیں۔ ایک شہنائی نواز اصلی سُر قائم رکھنے کے لئے سُر دیتا رہتا ہے اور ایک آواز کی چلت پھرت اور پڑھت کی مشق دکھاتا ہے اور یہی اصلی شخص ہوتا ہے جو مختلف راگوں کو انتہائی دلکشی اور مہارت سے آگا دکرتا ہے۔

روشن چوکی ہندوستان کا خاص درباری باجا تھا جو بادشاہوں اور اعلیٰ ترین اُمرا کے خاصے کے وقت بجا کرتا۔ رات کو آرام کے وقت روشن چوکی شاہی محل کے گرد گشت کیا کرتی اور اس کا نغمہ دور سے بہت ہی لطف دیتا۔ دولتِ مغلیہ میں یہ بہت ہی اہم اور لطیف باجا خیال کیا جاتا اور دہلی میں خدا جانے کب سے رواج پذیر تھا یقیناً لکھنؤ میں روشن چوکی بجانے والے دہلی سے آئے ہوں گے۔ مگر اس کے صاحب کمال ان اطراف میں بھی مدت سے موجود تھے۔ بنارس کے اکثر مندروں میں آج تک صبح کو روشن چوکی بجا کرتی ہے اور تڑکے منہ اندھیرے کہیں قریب سے جا کر سنیئے تو بڑا لطف آتا ہے۔

لکھنؤ میں علی العموم شادی کے جلوسوں میں روشن چوکی بجانے والوں کا رواج پنجاب کے کشمیریوں میں بھی تھا کیونکہ کشمیر میں جس گھر میں شادی ہوتی اس کے باہر دو روز پہلے

روشن چوکی بیٹھ جاتی تھی۔ وہاں سے یہ کلچر ان کشمیری لوگوں میں بھی آیا جو پنجاب میں آکر آباد ہوئے چنانچہ یہاں کشمیری برات میں روشن چوکی بجانے والے دولہا کے آگے آگے ہوتے تھے۔ اور انہیں کشمیری باجا کہا جاتا تھا اور انہیں قدم قدم پر انعام دیا جاتا تھا روشن چوکی بجانے والے تجربے میں لکھنؤ سے اچھے کہیں نہیں ملیں گے۔ جس قدر لے داری اور ہر چیز کو دلکش دھنوں میں سچے سُروں کے ساتھ اہل لکھنؤ ادا کرتے ہیں اور کسی مقام کے روشن چوکی نواز نہیں ادا کر سکتے۔ ان کے کمال اور فن کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کوئی شوق سے سُنے اور داد دیتا جائے۔ بادشاہوں اور عالی مرتبت امیروں کے جلوس اور لشکر کے ساتھ نوبت بہت لازمی شے تھی۔ فاتح تاجداروں کے جلوس کے آگے آگے ہاتھیوں پر نوبت بجتی جاتی تھی۔ لڑائیوں میں غالب آنے والا گروہ اپنی فتح مندی اور غلبے کے اظہار کے لئے زور شور سے نوبت بجواتا تھا۔ شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر نے حیدر آباد کو فتح کر کے اس کے قریب ایک پہاڑی پر نوبت بجوائی تھی جو آج تک نوبت پہاڑ کہلاتی ہے۔ سلطنت مغلیہ میں دربار کے اعلیٰ ترین طبقے کے رئیسوں اور عہدہ داروں کو بادشاہ کی طرف سے نوبت کا حق دیا جاتا۔ جو اپنی ڈیوڑھیوں میں نیز اپنی سواری میں نوبت بجوایا کرتے۔ نوبت بجانے والوں کے لئے کوئی بلند برج منتخب کیا جاتا جس کے نمونے ہر بڑے شہر میں جہاں کوئی بڑا دربار رہ چکا ہو نظر آتے ہیں اس قدیم رواج کی پیروی میں لکھنؤ میں آج تک معمول ہے کہ جس دولت مند شخص کے ہاں شادی یا کوئی خوشی کی تقریب ہوتی ہے تو اس کے دروازے پر لمبی لمبی بلیاں کھڑی کر کے اور سرخ کپڑے اور پنّی وغیرہ سے منڈھ کے عارضی طور پر ایک بلند نوبت خانہ بنوا دیا جاتا ہے۔

یہ تھی دبستان لکھنؤ کے مشرقی تمدن کی ایک آخری جھلک۔ اس کے بعد ہم اس پس منظر میں لکھنؤ کے شعرا کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کریں گے اور ہمارے قارئین ان کے فن اور کلام کو اس عظیم ثقافت کی روشنی میں بہتر طریق سے سمجھ سکیں گے۔

اُردو شعر کا ایک مستند تاریخی و ادبی سلسلہ

اُردو شعر کی داستان

مؤلف: اے حمید

اُردو شعر کی مکمل تاریخ جاننے کے لیے اِس تاریخی، علمی و ادبی سلسلے کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

اُردو ادب کے طلبأ کے لیے
ایک نایاب حوالہ جاتی و مطالعاتی سلسلہ

اِس وقت تک اِس قسط وار ادبی سلسلے کی ۹۔ اقساط شائع ہو چکی ہیں!

ہر ماہ کی ۲۰ تاریخ کو اپنے قریبی بکسٹال / ہاکر سے طلب فرمائیں!

قیمت ہر قسط تین روپے

روشن کتابوں کا ایک روشن سلسلہ

مُسلم شخصیات کا
انسائیکلوپیڈیا
(تاریخ اسلام کے آئینے میں)

مؤلف
ایم۔ ایس ناز

اِس وقت تک اِس روشن سلسلے کی دس اقساط شائع ہو چکی ہیں!

ہر ماہ کی دس تاریخ کو اپنے قریبی بکسٹال / ہاکر سے طلب کریں ــــ قیمت ہر قسط تین روپے

روشن کتابیں

مطبوعات شیخ غلام علی
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور